۲۳ گھنٹے کا شہر
احمد یوسف

۲۴ گھنٹے کا شہر

احمد یوسف

(یہ کتاب بہار اُردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے)

پہلی اشاعت : ـــــــ ۱۹۸۴ء

تعداد : ـــــــ ایک ہزار

صفحات : ـــــــ ایک سو چالیس

خوشنویس : ـــــــ ابوالکلام عزیزی

مطبع : ـــــــ پنٹ لیتھو پریس، رمنا لین، پٹنہ

قیمت : ـــــــ بیس روپے

ملنے کے پتے :

بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴

عرفان یوسف، صدر گلی، پٹنہ ۸۰۰۰۰۸

کھرل اکیڈمی، مدینہ ہاؤس، جگسو میان [illegible]

شبخون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی، الہ آباد

نیّر اور میمُونہ کے نام

تمہاری راہ میں میری دُعا کے پھُول کھلیں،

ترتیب

- اُن کی تجربہ گاہ
- فرد
- کل کی شب
- صد ہزار قصے
- دشت بہ دشت کُو بہ کُو
- جلوس
- یہی آدمی یہی آدمی
- مکالمہ
- صُورت اک بے کسی کی
- قربت کی دُوری
- بستی ایک نئی ہے
- رشتہ
- آنے والا
- طلب ایک گذرگاہ کا
- کاروبار
- حالات
- اُترتی چڑھتی رونقیں
- ۲۴ گھنٹے کا شہر
- مجلس
- وقتِ رخصت

۵

اُن کی تجربہ گاہ

وہ آج سویرے سے اُس کی راہ دیکھ رہے تھے۔

پر یہ کیسے کہا جا سکتا تھا کہ وہ اسی کی راہ دیکھ رہے تھے؟ کیونکہ ان میں سے ایک جس نے گہرے رنگ کی بڑے بڑے چیک والی قمیض اور گہرے ہی رنگ کی چُست پتلون زیب تن کر رکھی تھی، جس کے بال کی بیلیں گردن سے بہت نیچے تک اُتر آئی تھیں اور سائڈلاک کے نیچے چہرے پر تقریباً تین دن کا شیو نظر آ رہا تھا، جس نے گلے میں ایک سونے کی چین ڈال رکھی تھی، کہتا تھا کہ اُسے کم از کم ایک دس کیلو کی مچھلی کی ضرورت ہے۔

دوسرا جس کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی، جس نے سر پر الٹی کیپ جما رکھی تھی، جس کی قمیض پر شوخ رنگ کا پرنٹ تھا اور پتلون بل باٹم تھی، ایک کشادہ سینہ توی ہیکل مرغ کی بات کر رہا تھا۔

تیسرا جس کی اسپورٹس شرٹ کے بائیں جانب سینے کے قریب سیاہ دھاگوں سے کوئی چڑیا بنی تھی، جس کی پتلون کا رنگ ڈرائے کی تھی، جس کا شیو بالکل تازہ تھا اور جس نے گلے میں ایک صلیب

ڈال رکھی تھی، بار بار ہرن کے کباب کا ذکر کر رہا تھا۔

چوتھا جس نے قلندروں کی وضع میں چاروں ابرو کا صفایا کروا رکھا تھا، جس کے جسم پر ایک گلابی رنگ کا کرتا تھا، جس پر سرخ دھاگے سے خوبصورت گل بوٹے اُگائے تھے، جس کے نیچے سیاہ رنگ کی ایک چمکدار پتلون تھی اور جس نے ایک ہاتھ میں کڑا پہن رکھا تھا، ایک قد آدم بکرے کے ہجر میں مرا جا رہا تھا۔

بہرحال یہ کہ جب وہ ملا تو جیسے اُن کے چہروں پر بہاریں ٹوٹ پڑیں، اور انہوں نے ایک بے حد خوشگوار موڈ میں اُسے گھیر لیا، اس واسطے وہ اُن سے ذرا بھی خائف نہیں ہوا۔ یوں بھی وہ کافی موٹی جلد کا، نہایت مضبوط اعصاب والا متوسط العمر آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے براؤن شیڈ کا ٹریلین کا سوٹ پہن رکھا تھا، جس کے نیچے گہرے عنابی رنگ کی ٹائی تھی، جسے ٹائی پن نے دبا رکھا تھا۔ چہرہ صاف تھا اور آدھا سر پچھلی رات کی برفباری کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا: کہیے میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔"

"بات یہ ہے جی ....."

"بابو جی کہو، انہیں پورا سمان دینا چاہیے۔"

"بڑے بھیا کیسا رہے گا۔"

"ہاں ہاں چاچا جی بھی کہہ سکتے ہو۔"

"ویسے سسر جی بھی چل سکتا ہے۔"

"خیر خیر آگے فرمائیے۔"

"پہلے ہم لوگ اپنا تعارف کرا دیں۔"

"یہ جی سورج ہے، میں چاند ہوں، یہ تارہ ہے اور یہ بادل ہے۔ ہم سب آکاش سے اُترے ہیں ایک خاص مشن لے کر۔"

"اور میں جی سکھ چند ہوں۔ یہاں سڑک نمبر ۲ پر میرا ایک موٹروں کا کارخانہ ہے۔ مجھے پیشاب میں شکر آنے لگی تھی، سو ڈاکٹر نے پیدل چلنے کا مشورہ دیا ہے۔ گھر یہاں سے کوئی ڈیڑھ میل پر ہے، پیدل

ہی آتا جاتا ہوں۔ کار بہت کم استعمال کرتا ہوں۔"

لعل چند نے پھر وہی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"تو آکاش بابیو! آپ لوگ کیا ہیں اور آپ کا مشن کیا ہے؟"

انہوں نے نہایت ہی دوستانہ فضا میں بات چیت شروع کر دی تھی۔

"میں جی۔ پی۔ ایکسٹنڈی ہوں، یہ سی۔ ایچ۔ ڈی ہے، یہ ایس۔ ٹی۔ ڈی ہے اور یہ ایل۔ ایس۔ ڈی ہے۔"

"بہت خوب، بہت خوب۔"

"تو گویا آپ پر بھی رعب پڑا ہم لوگوں کی قابلیت کا۔"

"اور مشن ہے ہم لوگوں کا سوشلزم کو عمل میں لانا۔"

انہوں نے نئے سرے سے ایک ایک چہرے کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ وہ بے حد مطمئن دکھائی دیتے تھے۔

"دیکھئے آپ تو بڑے جہاں دیدہ ہیں، آپ ہم لوگوں کی شادی وادی کی فکر نہ کیجئے۔"

"کیوں؟"۔ انہوں نے ہنسی کو تقریباً روکتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیونکہ ہم سب ہی تقریباً شادی شدہ لوگ ہیں۔"

"یہاں کا ایس۔ پی میرا سالا ہے۔"

"ڈی۔ ایس۔ پی اس کا سسر ہے۔"

"علاقے کے انسپکٹر کی لڑکی سے اس کے تعلقات ہیں۔"

"اور علاقے کے ہیڈ کانسٹبل سے اس کا تو دور کا رشتہ ہے۔ یعنی وہ اس کا عاشق ہے اور یہ اس کی بٹیا کا۔"

"اچھا جی۔"

"ہاں جی اور ہماری سسرال بھی بہت قریب ہے۔"

"اور دھرم کرم آپ لوگوں کا۔"

"یہ تو اوپر والا ہی جانتا ہے کہ ہم لوگ تو ڈائرکٹ آکاش سے اُتارے گئے ہیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے میرے گلے میں سونے کی چین ہے، مگر میں ہندو نہیں ہوں۔ اس کے سر پا نوڈ کیپ ہے لیکن یہ مسلمان نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ میں کڑا ہے مگر یہ سکھ نہیں ہے لہٰذا اس نے صلیب لٹکا رکھی ہے مگر عیسائی نہیں ہے۔"

"بہت خوب بہت خوب تو ینگ بوائز میں اب اجازت چاہوں گا۔"

لو جی ہو گیا بیڑا ہی غرق۔ ٹھنڈی سڑک

(وہ ق سے مجبور تھا)

'ابے تو گاتا کیوں نہیں۔'

'ابھی نہ جاؤ چھوڑ کے کہ دل ابھی بھرا نہیں۔'

'سالے سسر جی سے مذاق کرتا ہے۔'

"بات یہ ہے شریمان جی کہ آپ کو تو معلوم ہی ہو گیا کہ ہم لوگ ایک خاص مشن لے کر آئے ہیں۔ یہی دیکھئے کہ میں مچھیرا ہوں اور بنسی لئے مچھلیوں کی راہ تکتا ہوں۔ یہ مرغے مرغیوں کا کاروبار کرتا ہے اور ہر صبح ایک نئے مرغ کا انتظار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہمارا جہ دشینت ہے، ہرن کی آنکھوں کا پجاری بیراگن کسی بھاگتے ہرن کو دام میں لانے کی فکر میں دُبلا رہتا ہے۔ یہ چرواہا ہے بچے بکریاں پالتا ہے اور یہاں بیٹھا تندرست بکروں کی جدائی میں گھٹتا رہتا ہے ۔۔۔ لیکن آج صبح سے ہم سب بیکار رہے اور ہماری سوشلزم بری طرح اٹکا جا رہی ہے۔"

"تو پھر حکم دیجئے۔" لعل چند نے اسی خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

"معمولی سی بات ہے جی۔ آپ ہماری سوشلزم کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالئے بس آپ سے یہی درخواست ہے۔"

"نہیں جی توبہ کیجئے میں تو خود دل سے سوشلسٹ ہوں۔"

"واہ، واہ، واہ۔"

"لعل چند جی زندہ باد۔"

"تو پھر جناب عالی آپ خود ہی سب کچھ قومی بینک کے حوالے کر دیں۔"

"ٹیبل فین، انگوٹھی اور دوسری چیزیں ہم نہیں لیں گے، بس ایک نقدی۔"

'Sir, We don't kill the Goose that lays the Golden Egg.'

"یہ ہماری سوشلزم کا بنیادی اصول ہے۔"

"لیکن چاچا یہ -/480 کا کونسا حساب ہوا۔"

"چپ بے۔ -/20 روپے وہ نا ٹپسٹ لونڈیا لے اُڑی ہوگی، جس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک چاچا نے چرائی ہے۔"

"بات یہ ہے آکاش بابو کہ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ آپ اس سڑک پر آکاش سے سوشلزم لانے کے لئے بھیجے گئے ہیں، ورنہ میں حساب سے روپے لاتا۔"

"Thanks God" — آپ کو ہمارے مشن کا اتنا خیال ہے۔"

"دراصل چکر یہ ہے سسر جی کہ سوشلزم میں ہر شہری کو برابر برابر خوش رکھنا پڑتا ہے اس لئے اگر روپے حساب سے نہ ہوں تو کام SUFFER کرتا ہے۔"

"اب دیکھئے نا۔ -/100 روپے ہوٹل والے کے، -/50 چائے والے کے، -/25 روپے سگریٹ والے کے۔ اور یہ جو حرامی ہے، یہ بیسوں جو بٹنے والوں میں سوشلزم بانٹتا پھرتا ہے۔ ایک -/25 ان کے لئے بھی۔ -/100 روپے 'ساقی' کے کاؤنٹر پر جائیں گے، پھر ان خدائی خواروں کی گولیاں 'سورگ' کے تحفے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ہم لوگ ایک لمبی چوڑی سسرال بھی رکھتے ہیں، سخت حرامی ہیں ہمارے سالے سسر۔ ایک آپ ہی سسر جی کہ آپ نے ہماری رقم سے صرف -/20 روپے اپنی لونڈیا پر خرچ کئے۔ اسے کہتے ہیں ایمانداری۔"

"اچھا تو پھر — زندہ باد۔"

"زندہ باد —"

"اور ہاں، ہو سکے تو کل اپنے ہی طرح کے ایک آدھ سوشلسٹ کو اور بھیجئے نا ادھر۔"

۱۹۷۴ء

—◆—

فرد

وہ سایہ سا لگتا ہے۔
شاید اس کے وجود کے قدم ابھی ابھی آگے کو بڑھ جائیں گے اور وہ بھی کسی اور طرف نکل جائے گا۔
لیکن پھر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا وجود کہیں غائب ہو گیا ہے اور وہ مضطرب ہے کہ میں سایہ ہوں، تو پھر میرا وجود کہاں ہے؟ — اور اگر میں خود وجود ہوں تو پھر میرا سایہ؟ —
ایک الجھن — کئی کئی گھڑی دور کی دردسری۔
میں اس کے تردداُت کو کسی قدر بھانپ لیتا ہوں اور آگے بڑھ کر اس سے دریافت کرتا ہوں کہ —
لیکن خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے اس سے کیا دریافت کیا۔
اُس کا اتہ پتہ؟ —
اُس کا مزاج؟ —
اُس کے روز و شب؟ —

پھر یہ کہ ہر لمحہ وہ اپنی متوحش نگاہیں آگے کی جانب دوڑاتا، انہیں اپنے قدموں پہ ڈال دیتا
اپنی پشت کی طرف لے جاتا ——— کبھی وہ آگے بڑھنا چاہتا اور نہیں بڑھتا۔ کبھی وہ پیچھے جانا
چاہتا اور نہیں جاتا — کچھ عجیب طرح کی گم گشتگی تھی کہ وہ تھا بھی اور وہ نہیں بھی تھا۔

میں نے اسے اپنی گرفت میں لیا اور تب کئی صدیوں تک گویا میں نے وجود سے سائے کا سفر
اور سائے سے وجود کا سفر کیا۔

اور اس کے بعد میرے دل نے کہا۔ تم نے جو سوچا تھا، سچ ہی سوچا تھا — یہ وجود ہے مگر
وجود نہیں ہے، یہ سایہ ہے مگر سایہ نہیں ہے۔

میں نے اسے مخاطب کیا — 'اچھا مجھے نہیں تو پھر یہی بتاؤ......!'

تب ہی میں نے اس کے پیٹ پر اپنا کان رکھ دیا — پیٹ پیٹھ تک پہنچ گیا تھا، اور
شہر خموشاں کا شور تھا کہ آسمان سر پر اٹھا رہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا — 'یہ شور کب سے اٹھ رہا ہے؟' — ابتدا سے اسی طرح؟ —
یا یہ حالیہ زمانے کی بات ہے!

لیکن وہاں تو سائے کو وجود کی تلاش تھی، اور وجود کو سائے کی۔

میرے اصرار پر کہ یہ شور کب سے اٹھ رہا ہے، اس نے ہاتھ سے 'پتہ نہیں' کا اشارہ کیا۔
دلچسپ بات یہ تھی کہ ہاتھ کی کھری کھری انگلیاں، ایک دور تک جاتے ہوئے سفر (جو حد امکان سے
بھی پرے چلا جاتا ہے) کا پتہ دیتی تھیں۔

عجیب سی بات تھی کہ وہ جو 'ہاں' سے 'آں' کی راہ بھی مشکل سے طے کر سکتا تھا، اس کے آگے
ایک ایسا سفر تھا جس کا آدمی کنارہ وہم و گمان کی سرحدوں سے بھی آگے نکل چکا تھا۔

میں نے اس کے ملبوس کو غور سے دیکھا۔ اس کی اپنی رنگت کب کی اڑ چکی تھی۔ شاید برسوں کا
میل، جس کا سب کچھ چاٹ گیا تھا — تار تار — کمزور و لاغر ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح ———
بچی کھچی دھجیاں زوال ہونے کی کوششوں میں مصروف۔ یہ کپڑے کئی ایک جگہ سے پھٹے ہوئے بھی
تھے، اور ان پہ پسینے اور میل سے مل کر ایک دائمی سی بو کے جھنڈے گاڑ دئے تھے ———

دیر سے یہ بُو میرا پیچھا کر رہی تھی، مگر مجھے اس بات کی خبر ہی نہیں تھی کہ یہ بُو اسی کی ہے جسے میں نے اسیر کر رکھا ہے۔

ایک اذیت بھرا تنفر میری رگ و پے میں دوڑ گیا ـــــ ایک برتی زد جیسا ـ ـ ـ شرم نہیں آتی تمہیں ؟ ـــــ مگر میں کچھ بھی تو نہیں کہہ سکا۔

پھر بھی میں نے یہ پوچھ ہی لیا کہ اس کے پاس کوئی اور جوڑا ہے ؟ ـــــ اس نے نفی میں گردن ہلا دی ـــــ

میں نے دل میں سوچا ـــ "یہ تو کٹ کے گرنے والا ہے ؟" ـــ اس کے بعد کیا ہو گا ؟ ـــ لیکن 'بعد' کے ہر لمحے اس کی گرفت میں (اگر ماضی) کے سرخانے میں چلے جاتے۔ اسی لئے میں نے زمانے کی بات چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

سوچو ذرا سوچو ـــــ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان حالات میں کوئی نئی تُلی بات کہنے کے لئے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔

اسی اثنا میں نے اس کے ہاتھ پاؤں ٹٹول کر دیکھے ـــــ

'تو کیا واقعی یہ سایہ ہی ہے ! ـــــ کہ اس کے شریانوں کا دریا سوکھ چکا ہے' اور اس سوکھے دریا میں مچھلیاں دم توڑ چکی ہیں۔ جلد گوشت و پوست کی قید سے آزاد ہو چکی ہے۔ آنکھیں پیچھے ہٹتے ہٹتے کسی غار میں ڈوب چکی ہیں۔ بس لے دیکے تیز اور نوکیلی ہڈیاں ہیں جو جسم کے بے برگ و بار صحرا میں کانٹے بن کر چبھ رہی ہیں۔

تب ہی اس کی قطرہ قطرہ ٹپکتی آنکھوں نے ایک کہانی سنائی ـــــ کل کی اور آج کی ـــــ

لیکن جانے کیوں میرے دل میں ذرا بھی ہلچل نہیں مچی۔ اس کے نئے ہمدردی کا کوئی بھی سوتا نہیں پھوٹا ـــ اور یہ اتنی غیر متوقع بات تھی کہ خود مجھے بھی اس پر حیرت ہوئی ـــ

ـــــ ہونہہ یہ کیا خاک برق و باد کو گرفتار کرے گا کہ عالم تو یہ ہے کہ اس کے

پیٹ میں شکستہ حال قبروں کا شور اُٹھ رہا ہے، تن پر ایک تعفن زدہ حال جھول رہا ہے۔ منہ میں ایک ناتواں سی 'ہاں' ــــ 'آں' بھی گم ہو چکی ہے، اور جسم کے ریگ زاروں میں محض کانٹے ہی کانٹے اُگے ہیں۔

ان حالات میں کون اس سے کہے کہ اُس کا تعاقب کرو جو تمہارا سب کچھ لے کر بھاگا جا رہا ہے!

سنہ ۱۹۷۲ء

کل کی شب

وہ انتظامیہ میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے اور نئی آبادیوں کی سمت رہتے تھے جہاں فرنگیوں، نیم فرنگیوں اور اعلیٰ ہندوستانی افسروں نے بڑی بڑی کوٹھیاں بنالی تھیں۔

لیکن ایک خاص بات جو انھیں دوسرے افسروں سے کسی قدر الگ کردیتی تھی وہ یہ تھی کہ مزاجاً و طبعاً وہ خود کو سرحد پر کھڑا محسوس کرتے تھے۔ کئی سال انگلستان میں رہ چکے تھے، اٹھنا بیٹھنا انگریزوں کے درمیان تھا لیکن کسی دیسی قدر کی تلاش جو گہرائیوں میں ملتی ہے، انھیں مشاعروں، عرس کی مجلسوں اور میلاد شریف کی محفلوں میں کھینچ لاتی۔ جب وہ تین پیس کا سوٹ پہن کر سر پر اونچی انگریزی ٹوپی جما کر اور گردن میں سخت سا 'بو' لگا کر شرکت کرنے کو سخت خلاف وضع تصور کرتے تھے۔ ان صحبتوں میں وہ انگرکھا، اکڑی ہوئی پلے کی ٹوپی، برکا پائجامہ اور ریشمی جرابیں زیب تن کیے آتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک ریشمی رومال ہوتا، ایسا کہ پھیلے تو ایک جہان بن جائے اور سمٹے تو انگرکھے کی جیب کے ایک کونے میں آرہے۔

انھوں نے گھر کے مولوی سے فارسی، عربی اور اردو کے اونچے درجوں کے سبق لیے تھے اس طرح

اُن زبانوں کی شاعری، ادبیات اور حکیمانہ ابواب ان کے خون میں رچ بس گئے تھے چنانچہ انگریزی زبان و ادب اور قانون کی تعلیم نے ان کے اندر جہاں ایک توازن کی کیفیت پیدا کردی تھی، وہاں ایک کیفیت "کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے" کی بھی پیدا کردی تھی۔

وہ اپنی بارونق حویلیوں کو آباد اور گرم چھوڑ کر سرکاری کوٹھی میں جا بسے تھے۔ اس لئے فراوانی اور ریل پیل انھیں دونوں جانب سے میسر تھی، یعنی ان کے اندر کا ایک فرد تو یہ کہتا تھا کہ فرنگی کی یہ نوکری میرے لئے کیا ہے؟۔ میری زمینداریاں، میری حویلیاں، میرے باغات، میرے کسرت، اصل تو میرے لئے یہ ہیں۔ تب ہی اچانک دوسرا بول اٹھتا۔ 'میں تو اتنی بڑی سرکار میں اپنے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں۔ کوٹھی، بنگلہ، موٹر، بگھی، چپراسی، خانساماں، خدمتگار کیا نہیں ہے میرے پاس؟ ۔۔۔ یہ میری آبائی جائداد کیا خاک میرا مرتبہ بڑھائے گی'۔

یہ فراغت اور فراوانی طبیعت میں بڑی جولانی اور اُمنگ لاتی ہے۔ یہ جو میرے پیچھے آرہے ہیں ان کی حیثیت کسی جم غفیر کی تو نہیں ہے یہ تو ایک نیا لشکر ہے اور میں ایک فاتح ہوں جس نے اس فوج کی کمان سنبھال رکھی ہے۔ میرے سینے پر یہ تمام تمغے ہی تمغے ہیں اور میں یا جوش و ولولے سے سرشار آگے کی طرف بڑھتا جاتا ہوں۔

مشاعرہ مغرب کے بعد سے شروع ہو کر نصف شب کے قریب ختم ہوا تھا۔

بگھی کا روغن تازہ تھا نقش و نگار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ گھوڑے خوب سجے بنائے تھے۔ کوچوان اور خدمتگار وردی میں تھے، اندر منیجر اور مصاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ مصاحب دراصل انھیں پرانے شہر کی روایتوں کو پیار اور رکھنے کے صلے میں ملا تھا۔ انھیں کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ اس کا ساتھ رہنا کس قدر ضروری ہی ہے۔ شہر خاموش دھیمے لہجوں میں گفتگو سے کاروان شب۔ ایسے میں کوئی تو ایسا ہو جو ان کی گفتگو کو اونچے سُروں میں اٹھائے اور سارے عالم پیار اس کی تشہیر کرے۔ فراغت اور اطمینان نے جو عقیدہ انھیں سونپا تھا وہ یہ تھا کہ جو دنیا جا چکی ہے وہ بھی اچھی ہے اور جو دنیا آچکی ہے یا آرہی ہے وہ بھی اچھی ہے۔

کسے کسلمنے گھوڑوں کی ٹاپ زیادہ تیز تھی یا ساز و سامان کی بر ہم ۔۔ لیکن یہ ہم آہنگ

دونوں سمت سے بلند ہو رہا تھا۔

اس تہذیب نے ان عورتوں کو جو کسی کی نہیں تھیں اور سب کی تھیں بالاخانوں پہ بٹھا دیا تھا۔ اس پرانی آبادی کی تنہا شاہراہ پہ چوک اور دوسرے کئی عمارتوں میں خاصی بڑی تعداد میں آباد تھیں۔

مشاعرے کی باتیں غزلوں پر تبصرے اور شعرا کے خصائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ساتھ والے یہ کرتے کہ جب وہ تھک کر چپ ہو جاتے تو وہ ان کے دیئے ہوئے شعروں کو ادا کرنے کی کوشش کرتے، جب تک کہ وہ "ہوں" نہ کہیں۔

آغاز گرما کی رات تھی جب کہ کبھی پُروا چلتی ہے جس میں پینے پر پیاس اور بھڑکتی ہے ہر چند کہ اس ہوا کا جسم نرم اور گداز ہوتا ہے اور کبھی پچھوا چلتی ہے گرم اور دہکتی ہوئی مگر پینے پر پیاس بجھتی ہے۔ پر یہ کہ شراب کی تاثیر دونوں میں ہوتی ہے۔

اس رات پُروا چل رہی تھی جو سوکھے زخم کو ہرا کر جاتی ہے۔

بگھی مشاعرہ گاہ سے بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ انہوں نے گلا صاف کرتے ہوئے اپنے ساتھ والوں سے پوچھا۔ "ڈیرے دارنیاں تو اب سو چکی ہوں گی۔"

مصاحب نے کہا۔ "سرکار رؤسا کے اڈے تو پیچھے چھوٹ گئے۔"

"اچھا — چھا —" تب ہی انھوں نے بگھی سے سر نکال کر دیکھا —

چاروں اور کوٹھوں کا بازار سرد پڑ گیا تھا۔ رات سرسراتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہواؤں نے ساری آبادی کو سلا دیا تھا۔ بس دو چار، ادھر ادھر جاگ رہے تھے۔ ایک آدھ جواری جن کے ظروف سناٹے میں بھی صدائیں بلند کرتے۔ گجرے لٹکائے دو ایک پھول والے خالی سڑک پر چلتے دو ایک راہگیر اور دو کانوں کے اڈے پر سوئے ہوئے لوگ —

پاس ہی انہیں ایک کچا سا بے ہنگم سا کوٹھا نظر آیا، جہاں کرسی بچھائے لالٹین کی روشنی تلے، اپنی سوچوں میں غرق ایک سانولی دکھائی دی۔ انھوں نے کوچوان کو آواز دے کر بگھی رکوائی اور اس پورے منظر کو جیسے ذہن نشین سا کر لیا — اوپر میں لٹکی ایک لالٹین کہ جس کے نیچے کرسی بچھائے

ایک سانولی بیٹھی ہے ـــــ بے رونق سا، بے مرمت سا کچا کوٹھا، بہت تھوڑی سی وسعت والا۔ اس سے آگے اس منظر نے کچھ بتانے سے معذرت طلب کی۔

اور جب بگھی ٹھہر گئی تو انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "آؤ ذرا خدا کی اس مخلوق کو بھی دیکھ لیں۔"

ان دونوں کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ شرفاء کے جانے کی جگہ تو پیچھے چھوٹ گئی۔ اور یہ کمتر درجے کی زندگی ہے جو ایسے علاقے میں بستی ہے جو اہلِ ثروت کے لئے یکسر ممنوع ہے کہ یہاں معمولی درجے کے لوگ رہتے ہیں اور یہ دھاری نام کی شے سرے سے مفقود ہے اور چونکہ یہاں شرفاء کا آنا جانا نہیں ہوتا اس لئے یہ لوگ گندے اور بدتمیز ہوتے ہیں اور یہ کہ بہت سی بیماریاں ـــ لیکن ان کے تیور دیکھ کر وہ لوگ کچھ بھی تو نہیں بول پائے۔

منیجر ذرا دیر کو ہچکچایا تو انھوں نے قدرے اونچے لہجے میں کہا۔ "آئیے، اتریئے۔"

جب ہی وہ سب چل پڑے اور خدمتگار کا ہاتھ کی روشنی جلا کر پیچھے ہو لیا۔ کوٹھے کے نیچے پہنچ کر انھوں نے ایک لمحے کو رک کر زینہ تلاش کیا۔

زینہ کچا اور ناہموار تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر دونوں قدم ایک ساتھ رکھ دیئے گئے تو زینہ بیٹھ جائے گا۔ سڑک سے گندے نالے کا بھبکا سیڑھیاں چڑھتے وقت ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔

تین چار زینے کے بعد اندر کی دنیا صاف صاف نظر آنے لگی اور جب وہ زینہ طے کر کے برآمدے میں آ گئے تب انھیں اس بات کا علم ہوا کہ چھت جھولتی ہے اور اس کا سینہ ہر ہر قدم پر دہل اٹھتا ہے۔

تب ہی اس ایک منظر نے کنا دیتی تلے ایک لالٹین لٹک رہی ہے اور لالٹین کے نیچے کرسی پر ایک سانولی سی لڑکی بیٹھی ہے۔ اچانک پہلو بدلا اور اب وہ لڑکی انھیں جھک کر سلام کر رہی تھی ـ تھا جس نے اپنی ماں کو آواز دے کر کہا کہ 'دیکھو کون آیا ہے' ـــ اور ماں نے ایک سوتے ہوئے چھوکرے کو اٹھا کر یہ خبر دی کہ دیکھو کون آیا ہے ـــ

چھوٹے سے برآمدے میں ایک طرف ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ ادھیڑ عمر عورت دوڑ کر کہیں سے

ٹین کی ایک کرسی لے آئی۔ چھوکرا اپنی ران کھجلاتا ہوا اٹھا اور جس دری پر بیٹھا تھا، اسے اٹھا کر باہر تخت پر بچھا آیا۔

عورت نے کرسی بڑھاتے ہوئے کہا: 'تشریف رکھئے سرکار — آپ میرے گھر آئے ....'

عورت نے شرفاء کے لئے بھی کچھ سبق سیکھ لئے تھے کہ شاید زندگی میں کبھی کام آجائیں، اور یہ سبق اس نے اپنی لڑکی کو بھی سکھا دیئے تھے۔

وہ اس تکلیف دہ کرسی پر بیٹھ گئے جو ایک ناہموار سے فرش پر اونچی نیچی سی محسوس ہو رہی تھی۔ مینیجر اور صاحب تخت پر بیٹھ گئے، خدمتگار روشنی لئے کھڑا رہا۔

لڑکی بھی مؤدبانہ کھڑی تھی، اس طرح جیسے اپنا سراپا دکھا رہی ہے۔ خاموش خاموش سی۔

برآمدے میں لالٹین کی روشنی کو ایک اور رفیق ملا۔ تو اس نے خود کو کچھ اور دکھایا۔ پروں والا ایک براق — پربت اٹھائے ہنومان — ایک طرف فریم کیا ہوا 'اوم' دوسری طرف 'اللہ' کا طغرا — اور بھی کئی ایک ان مل اور بے جوڑ تصویریں۔

برآمدے سے ملی ایک نیم تاریک سی کوٹھری تھی جو ایک طرف تو برآمدے میں کھلتی تھی اور دوسری طرف ایک چھوٹی سی چھت پر، جس سے ملحق باورچی خانہ اور غسل خانہ جیسے دکھائی دے رہا تھا جسے تھوڑی بہت روشنی ملتی تھی تو اس برآمدے کی لالٹین سے اور باورچی خانے کے جلتے ہوئے دئے سے۔

یہی چھوٹی سی دنیا ہے جو کچے در و دیوار کی سوندھی سوندھی بو، نیچے بہتے ہوئے ملے کے گلے بجبجے 'سڑاندھ' سے بھیگے اور باورچی خانے کی پھیلتی ہوئی پیاز اور لہسن کی خوشبوؤں سے بسی ہوئی ہے۔

تب ہی عورت نے بڑھ کر کہا 'سرکار پان حاضر ہے'، ٹین کی ایک ہلکی پھلکی سی چکدار طشتری میں چند ایک بیڑے سجے تھے۔ سرکار نے ایک بیڑہ اٹھا کر ہاتھ میں دبا لیا۔

عورت پھر تخت والوں کی سمت بڑھ گئی اور جب وہ کوٹھری کی طرف جانے لگی تو انھوں نے اونچی آواز میں کہا، 'ہاں یہ لیتی جاؤ' — انھوں نے انگرکھے کی جیب سے ایک چھوٹا سا بٹوہ نکالا اور اس کے دو روپیے طشتری میں ڈال دیئے۔ عورت نے جھک کر سلام کیا۔

تب ہی لڑکی آگے بڑھی اور اس نے چھوکرے سے کچھ کھسر پھسر کی۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ

جھلنگا سا پلنگ جو دیوار سے لگا کھڑا تھا، بچھایا جا رہا ہے، مچان سے گدا اور تکیے اُتارے جا رہے ہیں۔
ایک جانب پردہ لٹکایا جا رہا ہے۔ باورچی خانے کا چراغ کوٹھری میں لا کر رکھا گیا ہے اور اور ......

یہ سب کرنے کے بعد لڑکی باہر نکلی اور اس نے دھیرے سے کہا۔

"سرکار تشریف لے چلیں"

انھیں جیسے ہوش آ گیا اور انھوں نے خفیف ہو کر کہا۔ "نہیں نہیں یہ سب کیا — میں تو بس یوں ہی آ گیا تھا۔ تم لوگوں نے غلط کیا ——"

یہ سن کر لڑکی پیچھے سے اندر گئی اور کچھ آہستہ سُروں میں اور کچھ تیز سُروں میں ماں سے بولتی رہی۔ — تب کے بعد ہتھیلیوں کو طشت سا بنا کر اور اس پر دونوں روپے سجا کر ان کے پاس لائی اور جُھک کر ملائم لہجے میں بڑے ادب سے بولی۔

"سرکار کنیز رنڈی ضرور ہے، مگر حرام کی کمائی نہیں کھاتی ......"

تب جیسے وقت رُک سا گیا ہو اور سناٹے نے اپنی سانسیں روک لی ہوں۔

چند ساعتوں کے بعد اچانک سناٹے چونکے اور ساتھ ہی زینوں سے سنبھل سنبھل کر نیچے سڑک پر آ گئے جہاں میونسپلٹی کے مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ پوسٹ یہاں سے وہاں تک روشن تھے، کیونکہ ان دنوں شہر میں بجلی نہیں آئی تھی۔

سنہ ۱۹۷۳ء

——✿——

صد ہزار قصے

دفتر سے بھاگتا ہوا نکلا تھا۔ سڑک پر بھی میری رفتار کافی تیز تھی لیکن میدان میں پہنچ کر میں خاصا سست رفتار ہو گیا۔ ہر روز یہی ہوتا ہے۔

دراصل میدان میں پہنچتے ہی دفتر دکھائی دینے لگتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ بس ایک ہی جست میں، میں دفتر کے اندر ہوں گا۔ ابھی تو پورے پانچ منٹ باقی ہیں۔

آج میں آہستہ آہستہ میدان کی روش پر چل رہا تھا۔ ایسے وقتوں میں میں سوچتا چلتا ہوں دفتر میری نگاہ کے دائرے میں ہے اور وقت میری گرفت میں ——— مکمل اطمینان اور آسودگی کا احساس۔

جب بھی ان لمحوں کا سامنا ہوتا ہے تو آدمی بڑا فلسفی ہو جاتا ہے اور بہت کچھ سوچنے لگتا ہے۔

کنارے کھڑے ہوئے درختوں کی چھاؤں۔ اس سے پرے جا بجا بچھی ہوئی بنچیں کہ جن کے نیچے مونگ پھلی کے چھلکوں اور چاٹ کے پتوں کا ڈھیر ہے۔ کنارے پھولوں کی کیاریاں ——— اس دنیا کی اندرونی پرت تو ہمیشہ سے سست رفتار خیالوں کے قبضے میں رہی ہے۔

میرے قدم دھیرے دھیرے بڑھ رہے ہیں۔ گھر کے قصے، دفتر کے، دوستوں کے اور پھر اس دنیا کے۔

تب ہی اچانک میری نظر روپئے کے ایک سکے پر پڑی جو سڑک کے کنارے میدان میں پڑا تھا۔
میں نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا کہ وہاں کوئی ہے تو نہیں مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر نزدیک یا دور کچھ لوگ
ہیں بھی تو وہ اس دلفریب منظر سے قطعی بے تعلق ہیں۔ یہ سوچ کر میں نے چپکے سے اس چمکتے ہوئے
شاہزادے کو اپنی جیب میں بسا لیا۔

چند قدم چل کر میں نے گھڑی دیکھی ـــ دفتر کو تین منٹ اور تھے۔ ابھی وقت ہے۔
میں نے جیب سے وہ روپیہ نکالا اور میں کنارے کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ روپے کو میں نے ذرا غور
سے دیکھا تو اس کی چمک کم ہوتی دکھائی دی۔ وہ خاصا عبدالٰہی تھا، اور جب میں نے اسے سیمنٹ
کے بنچ پر بجایا تو وہ چاروں ہاتھ پاؤں سمیٹ کر دھپ سے بیٹھ گیا ـــــ خدا کے لئے مجھے
نہ چھیڑو۔ مجھے کچھ شبہہ ہوا، کچھ تڑپنا چاہتا تھا، تالیاں بجا کر شور ہوا ـــ یہ تو ایک کریہہ آواز نکال
کر بیٹھ گیا۔

گھڑی کہہ رہی تھی ـــ "صرف ڈیڑھ منٹ اور ـــ غور و فکر کا یہ دفتر بھی دفتر ہی میں کھولنا۔"
دفتر پہنچ کر میں نے اپنی جیب کی تلاشی لی تو معلوم ہوا کہ اس ایک سکے کے علاوہ دو ایک
نوٹ تھے اور کچھ ریزگاریاں تھیں۔ ایک روپے کا کوئی دوسرا سکہ میری جیب میں نہیں تھا کہ میں
اس سے اس نئے سکے کی صحت ملاتا ـــ تب میں نے سنگھ، پرشاد، ددا اور رفیق احمد سے دریافت
کیا کہ کیا ان کے پاس کوئی ایک روپے کا سکہ ہے؟

آخر شرما کے پاس ایک روپے کا سکہ مل گیا۔ میں نے ہر طور پر اس سکے کو شرما کے سکے سے
ملایا، لیکن اس میں شرما کے سکے جیسی تڑپ، چمک دمک اور کھن گرج نہیں تھی۔

میرے دل نے سوال کیا ـــ "آخر یہ سکہ ہے کیا؟"

دوستوں نے کہا:

"کسی نہ کسی طرح تو چل ہی جائے گا۔ کسی نے پھنسایا تمہیں؟" ـــ

"کہیں بھیڑ بھاڑ میں چلا دینا۔"

"سینما کے ٹکٹ گھر یا بس میں چلا دینا۔"

"گویا اس میں خود چلنے کی طاقت نہیں ہے، وہ دھکے دے کر چلایا جائے گا۔"

'کمار اینڈ کمار جنرل اسٹورز' سے اگر بڑے دعوے والے صابن کی ایک ٹکی لی جائے تو اس سکے کے ساتھ دس پیسے اور بھی دینے ہوں گے۔ لیکن اگر یہ سکہ پہچان لیا گیا تو پھر مجھے لوٹانا ہوگا، اور صابن کی ایک نئی ٹکی میں پرسوں ہی خرید چکا ہوں۔ اگر یہ سکہ چل جائے تو ایک فاضل ٹکی میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر ——— بات یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس دو ٹکیاں ہو جاتی ہیں تو آپ پہلی کے استعمال میں وہ احتیاط نہیں برتتے جو دوسری کے نہیں ہونے پر برتتے ہیں۔

دراصل ہم لوگ ایک چھوٹے سے دائرے کے لوگ ہیں، ساری زندگی ہم لوگ اسی فن کی مشق کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے قدم اس دائرے سے باہر نہ نکلیں۔

لیکن میری جیب میں جو دو ایک نوٹ پڑے ہیں، ان کی طاقت پر یہ سکہ چل سکتا ہے، یعنی یہ کہ اگر نہ چلا تو پھر میں نوٹ بڑھا دوں گا۔

کسی فائدے کے لئے خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔

سینما کا ایک روپیہ پندرہ پیسے والا کاؤنٹر یاد آگیا۔ یہ ایک معروف ترین کاؤنٹر ہوتا ہے، جس کے آگے دور تک بل کھاتی ہوئی قطار ہوتی ہے، اور وہ تیزی سے اُسے چھوٹا کرتا جاتا ہے۔
لیکن اس کاؤنٹر پر دو افراد ہوتے ہیں۔ ایک نوٹ لیتا ہے اور دوسرا نوٹوں اور سکوں کی جانچ پڑتال کرتا جاتا ہے۔ اگر اس نے میرا سکہ بجا کر دیکھ لیا تو پھر کیا ہوگا؟ —— پھر وہی میرا نوٹ کام آئے گا۔

تب ہی ساری بھیڑیں میرے سامنے آگئیں۔ جن کے متعلق میں نے خبریں پڑھی تھیں، اور جن کے متعلق میں نے دوستوں سے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ کچھ بھیڑوں میں گھوڑے دوڑتے تھے، کچھ میں کاریں دوڑتی تھیں، اور کچھ میں آدمی دوڑتے تھے ——— اس بھاگ دوڑ سے بھاگ کر جاؤ تو پھر وہی بھاگ دوڑ۔
یوں یہ ایک روپے کا سکہ چل جائے تو یہ گھڑ دوڑ بھی گویا، ورنہ میرا نوٹ ہر حال میں قیمتی ہے۔

'چاٹ ہاؤس' میں بڑی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے، لیکن اگر نہ چلا اور میری جیب سے نوٹ نکل گیا تو اتنی مہنگی چاٹ پیٹ میں جا کر حشر بپا کر دے گی۔ فٹ پاتھ پر خوانچے والے کی چاٹ لو تو [illegible]

کی چاٹ خاصی ہو جاتی ہے، مگر 'چاٹ ہاؤس' میں تو ـــــ

ایک روپے کا سکہ میری قمیض کی جیب میں پڑا تھا۔ میز پر پلیٹیں تھیں ـــــ اور سامنے ایک سوالیہ نشان دیسے کھڑا گھور رہا تھا ـــــ کیا کیا جائے اس سکے کا؟ ـــــ

کسی اسٹور میں چلے جاؤ، تو وہ پہچان لینے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہے گا۔

"بابو جی ذرا اسے بدل دیجئے۔"

اور اس کی ایک مسکراہٹ کتنے ہی قہقہوں کو اپنے دامن میں چھپائے بیٹھی ہو گی

"بابو جی یہ سب ہم ہی سے کرنا تھا۔"

"بابو جی آپ بھی ویسے ہی نکلے۔"

پھر 'یہ سب' کے بھی کتنے رُخ تھے، اور 'ویسے ہی' کے بھی کتنے پہلو تھے ـــــ

ویسے وہ یہ بھی تو سوچ سکتے ہیں کہ میں نے بھی کسی سے دھوکہ کھایا ہو گا، مگر لوگوں نے اب اس ڈھنگ سے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

اگر میری انگلی کٹ جانے سے چند قطرے خون کے میرے دامن پر گر جاتے ہیں، تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں نے کسی پر چاقو چلایا ہو گا، تب ہی میری انگلی زخمی ہوئی اور دامن پر خون کے دھبے جم پڑے۔

ہر شخص یہ سمجھے گا کہ خود میں نے ہی اس سکے کو ڈھالا ہے۔

یہ سوچ کر میرے دل میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی ـــــ آخر میں نے اس بے جان سکے کو میان سے اٹھایا ہی کیوں؟ ـ ـ

کتنے ہی ہاتھوں سے گذر کر یہ سکہ مجھ تک پہنچا ہو گا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ شخص جس نے اسے ایک جذبہ بناکر میرے ہاتھ میں پھینک دیا تھا، مجھ سے کہہ رہا ہے۔

"یہ ایک ایسی دولت ہے جو ترقی دولت کی فصل اگاتی ہے۔ کچھ ہی سوچ کر میں نے اسے خاک کے سپرد کر دیا تھا۔" ـ

پر یہ کہ اسی ایک سکے میں (جو مجہول سا تھا۔ اور جو تالیاں بجانا اور ناچنا گانا نہیں جانتا تھا) یہ صفت تھی کہ اگر وہ چل گیا تو منفعتوں کی ایک چھوٹی سی فہرست بنائی جا سکتی ہے جن پر میں نے کچھ غور بھی کیا ہے، اور ابھی بہت کچھ غور کرنا باقی بھی ہے ___

بچوں کے لئے مونگ پھلی ___ بھنے ہوئے چنے ___ رسیلی گنڈیریاں۔

جب تک میرے پاس نوٹ ہے یہ سکہ کمزور نہیں ہو سکتا۔

سکے کا چل جانا ہر حال میں فائدے کا سودا تھا، لیکن اس کے چکر میں نوٹ کا نکل جانا گنوانے کا ___

یہ خوانچے والے کسی کا بھی خیال نہیں کرتے۔ میری یہ سفید پونجی ایکدم جھپکتے ہی خاک میں مل سکتی ہے ___ اسی دن کی بات ہے اس غریب بابو کا گریبان تھام لیا تھا۔ شاید نوٹ پھٹا تھا، یا پیسے کچھ کم دے رہا تھا۔

اچانک ایسا محسوس ہوا کہ وہ سکہ میرے ہاتھ سے کامیابی کے ساتھ دوسرے ہاتھ میں چلا گیا ___ 'کمارا اینڈ کمار جنرل اسٹورس' کا کاؤنٹر ___ کسی سینما کا ٹکٹ گھر ___ کوئی 'چاٹ ہاؤس' ___ کوئی خوانچے والا ___ کوئی ریڑھی والا ___

لیکن دوسری ہی ساعت ایک مفلس و نادار میرے سامنے آکر کہتا ہے ___

"خدا تمہاری سات پشتوں سے سمجھے" میرے اندر کے دونوں دریاؤں میں سخت طوفان آیا ہوا تھا۔

سارے دن ایک بڑے دفتر میں ایک چھوٹا سا دفتر کھلا رہا۔

دفتر سے واپسی میں، دوستوں کے ساتھ چلتے ہوئے بھی میں اکیلا تھا۔

میرے حصے میں صابن کی ایک نئی ٹکیہ آسکتی تھی ___ سینما کا ایک شو ___ 'چاٹ ہاؤس' میں میری پسندیدہ مٹر کی چاٹ ___

لیکن پھر سارے منصوبے اسی گہرے دریا میں غرق ہو جاتے۔

وہ ہر ہاتھ میں پہنچ کر ایک مسئلہ بنے گا ___ اور ہر ہاتھ سے نکلنے کے بعد اپنے پیچھے نفع و

نفرت کی ایک داستان چھوڑ جائے گا۔

تو اسے ہی فتح و نصرت کہتے ہیں۔

دین محمد کے ورکشاپ کے سامنے پہنچ کر اچانک میرے قدم تھم گئے۔

"خان صاحب زیادہ لوہا کاٹنے والی قینچی دینا"۔

گھر آکر میں نے اس سکّے کو کاٹ کر دو کر دیا۔

اب میرے بچوں کے ہاتھ میں کٹے ہوئے دو چاند تھے اور وہ خوش تھے کہ انہیں کھیلنے کو ایک چمکتی شے مل گئی۔

۱۹۷۷ء

دشت بہ دشت کو بہ کو

فقیر نے اپنی جھولی سے پھٹا ہوا بوریہ نکالا اور اسے سیلے ہوئے ٹوٹے پھوٹے فرش پر بچھا کر خرقہ سمیٹتے ہوئے بیٹھ رہا۔

باہر اُجالے اپنی اقلیم اندھیرے کے سپرد کر کے کوچ کی تیاریاں کر رہے تھے، اور وہ شور جو سناٹے کے سینے سے اُبھرتا ہے اور جسے اندھیرے کے جھینگر کچھ اور تیز کر دیتے ہیں، بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔

فقیر زیر لب بڑبڑایا۔ "اندھیرا چھا رہا ہے"۔ اور یوں اس پر تسخیر پانے کے لئے اس نے موم کی شمع نکال کر روشن کر دی۔

اب جو منظر اس کی نظروں کے سامنے تھے وہ کچھ یوں تھے — اوپر نیچے اور سامنے ہر طرف جالے، دراڑیں پڑی ہوئی دیواریں کہ جن کے پلستر جگہ جگہ سے اُکھڑے ہوئے تھے۔ سیلن کے سبب ہر طرف کائی کی دبیز تہیں، چھت کے سینے میں پیوست کسی پودے کی جڑیں۔ بغیر دروازے کا ایک حجرہ اور سامنے چیختا ہوا اندھیرا —

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فقیر کسی کی راہ دیکھ رہا ہے۔

تب ہی دور کہیں ایک پتہ کھڑکا تو فقیر نے نظر اٹھائی۔ پھر بار بار شاخیں جھنجھنائیں، زمین پر پڑے خشک پتوں نے چیخیں بلند کیں اور یہ شور قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔

فقیر ان ساعتوں سے قطعی بے فکر تھا۔ لگتا تھا اسے اپنے ہی جیسے کسی ذی نفس کا انتظار ہو۔ تب ہی ایک شخص روشنی کے دائرے میں نمودار ہوا۔ لانبی سی قبا زیب تن کیے بغل میں ایک جھولی دبائے۔

اس نے آتے ہی ایک زوردار سلام کیا، اور مصافحے اور معانقے کے بعد بوریے پر بیٹھ گیا۔

"دور سے مجھے یہ روشنی نظر آئی اور میں اسی سمت چل پڑا۔"

"اسی سبب سے میں نے یہ شمع جلائی تھی کہ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ اس کا سراغ لگاتا ہوا یہاں پہنچ جائے گا۔"

جب وہ بولتے تھے ان کی آوازیں جنگل کے شور کو کچل کر رکھ دیتیں۔

"اس بوریے میں ابھی اور وسعت ہے۔"

پھر وہ اپنے من کی دنیا میں کھو گئے، اس طور پر جیسے انھیں اس بات کا کامل یقین ہو کہ ان کی جمع تفریق کے کچھ لوگ اور بھی آئیں گے، تب سب مل کر تن کی دنیا کے دروازے کھولیں گے، فی الوقت تو صرف وہی دو ہیں۔

پھر ایک بار پتے کھڑکھڑائے، اور انھیں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ سناٹے نے ان کی سماعت کو بے حد تیز کر دیا تھا۔ وہ آواز نزدیک ہوتی گئی، حتیٰ کہ روشنی کے احاطے سے اک ذرا پرے انھیں ایک انسانی صورت نظر آئی۔

وہ شخص بھی کسی قلندری شان کے ساتھ وارد ہوا، اور علیک سلیک اور مصافحے و معانقے کے بعد وہ بھی فرش پر اپنی جھولی رکھ کر بوریے پر بیٹھ رہا۔

"روشنی دیکھ کر اس جانب چلا آیا۔"

"تم نے بہت خوب کیا۔"

بوریے میں اب بھی وسعت تھی۔

تب ہی ایک چوتھا فرد بھی روشنی کا پتہ لگاتے ہوئے وہاں آپہنچا، اور سلام و کلام کے بعد اس نے بھی بوریئے میں اپنی جگہ بنالی۔

اس روشنی میں سبھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ سب خاموش نظروں سے بس ایک ہی سوال کر رہے تھے۔

"اب کیا کیا جائے؟"— "یہ آپس کا مل بیٹھنا بے حد غنیمت ہے۔ یہ لمحے بڑے قیمتی ہیں انہیں یوں نہ گنوایا جائے۔"

پہلے فقیر نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "اللہ بس باقی ہوس"۔ یہی ہمارے تجربوں کا نچوڑ ہے۔

دوسرے نے کہا۔ "فقیر کا علم تو یہ کہتا ہے کہ جگ میں رہ کر جگ سے دور، خدا میں رہ کر خود سے دور۔"

تیسرے نے کہا۔ "چلتے چلتے میرے پاؤں شل ہو گئے، مگر منزل کہیں نہیں ملی۔"

چوتھا بولا — "سب کہانیاں ہی کہانیاں ہیں حقیقت بس ایک ہی ہے۔"

اس پر "حق ہے حق ہے" کی صدائیں گونج اٹھیں۔

اور تب پہلے فقیر نے ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا — "اللہ بس باقی ہوس۔"

وہ چونکہ سب سے پہلے آیا تھا، اور اس قربت کی تقریب کا وہی محرک تھا، اس لئے ہر حرکت گویائی اسی کی جانب سے ملتی تھی۔

"صاحبو رات ایک پہر گزر چکی ہے، فقیر کی جھولی میں کچھ سوکھی روٹیاں اور دو ایک بوٹیاں رہ گئی ہیں۔ آؤ بسم اللہ کرو"———

یہ کہہ کر اس نے اپنی جھولی میں ہاتھ ڈالا اور ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی کچھ روٹیاں اور بوٹیاں ان کے سامنے پیش کر دیں۔ اس پر سبھوں نے اپنی اپنی جھولیوں سے اپنے حصے کی روٹیاں، ساگ، سبزیاں اور آلو کے قتلے نکال کر درمیان میں رکھ دئے اور حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔

دیر تک وہ کھانے کے ساتھ انصاف کرتے رہے، اور جب سب کچھ ختم ہو گیا تو ان کپڑوں کو جن میں روٹیاں بندھی تھیں، جھاڑ کر اپنی جھولیوں میں رکھ لیا اور تب اپنی اپنی چھاگل سے خوب سیر ہو کر

پانی پیا۔

"کل کی فکر فقیروں کا شیوہ نہیں۔"

"حق ہے۔"

"حق ہے۔"

ان میں سے ایک نے اپنی جھولی سے ایک چھوٹا سا حقّہ اور چلم برآمد کی، اور تب اس پر تمباکو ڈال کر اور کوئلے جما کر اسے آگ دکھائی۔ دوسرے نے اپنی جھولی سے خشک تمباکو نکالا اور چونے کے ساتھ اپنی ہتھیلی پر دیر تک رگڑتا رہا، اور بالآخر اسے چٹکی چٹکی بھر چاروں کو دے دیا، جسے انہوں نے دانت کے نچلے حصے میں دبا لیا۔ اسی اثنا میں حقہ بھی تیار ہو گیا۔ حقے والے فقیر نے دو چار کش کھینچ کر حقہ آگے بڑھا دیا، اور وہ ان کے درمیان گشت کرتا رہا۔

ان میں سے ایک نے کہا: "اگر تم اجازت دو تو میں کچھ سناؤں۔"

"ضرور ضرور" سبھوں نے بیک زبان کہا۔

تب اس نے ایک گیت چھیڑ دیا۔

ہر گام پر رک کر میں نے ایک ایک سے پوچھا۔

منزل کہاں ہے؟ —

کوئی نہیں بتاتا۔

منزل کہیں نہیں ملی،

لیکن ہم اس کی تلاش جاری رکھیں گے،

جب تک ہمارے جسم و جاں سلامت ہیں،

اور ہمارے چراغ میں روغن باقی ہے۔

وہ سب آبدیدہ ہو گئے۔

اندر روشنی کے کھمبے میں ایک حجرہ تھا، جس میں گہری سیلن تھی اور ہر طرف جالے تنے تھے۔ کائی لگی دیواریں جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھیں اور ان کے پلاسٹر اکھڑ گئے تھے اور چھت پر جالوں کے

درمیان کسی پودے کی پتلی پتلی جڑیں تیزی سے اپنے قدم جما رہی تھیں۔

باہر سناٹے کا ہیبت ناک شور، جھینگروں کی دل دوز صدائیں اور وقفے وقفے پر پتوں کی جھنجھناہٹ سنائی دیتی تھی۔

اب نیند سے ان کے پپوٹے بھاری ہو چلے تھے۔

"آؤ اب لیٹ رہیں۔ اگر کل کا سورج دیکھنا نصیب ہوا، تو پھر سوچیں گے کہ کس سمت کو چلا جائے کہ کل کی فکر ہم فقیروں کا شیوہ نہیں۔"

اور تب وہ ٹانگیں پھیلا کر اور اس بات سے قطعی بے نیاز ہو کر کہ وہاں کسی وقت بھی سانپ بچھو نکل سکتے ہیں، اور کسی وقت بھی درندے آ سکتے ہیں، اس ٹوٹے پھوٹے حجرے کے سیلن زدہ فرش پر لیٹ رہے۔

کچھ ہی دیر بعد ان کے خراٹے، سناٹے کے شور سے کہیں آگے نکل چکے تھے۔

۱۹۷۷ء

جلوس

اب وہ گلی میں دھیرے دھیرے قدموں سے چل رہا ہے، اس طرح جیسے عام حالات میں چلا کرتے ہیں، ہتھیلی پر تمباکو مسلتے ہوئے۔

ایک دس کے نوٹ کی سلائی سی بنا کر اُس نے اپنے ایک کان کے اوپر اُڑس لی ہے۔

اسے اس عالم میں دیکھ کر لڑکوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں مختلف مکانوں اور گلی کوچوں سے نکل کر اس کے پیچھے لگ گئی ہیں۔ وہ سب شور مچا رہے ہیں، بے ہنگم صدائیں بلند کر رہے ہیں، تالیاں بجا رہے ہیں اور گالیاں دیتے جا رہے ہیں۔

بڑے بزرگ اس کی راہ سے ہٹ کر کنارے ہو گئے ہیں۔

— "کل تک تو یہ اچھا بھلا تھا"

— "تم کل کی بات کر رہے ہو، میں نے ابھی ابھی دیکھا تھا"

لیکن وہ شخص ان ساری باتوں سے بے نیاز، تمباکو مسلتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اُس کے آگے گلی ہے، لیکن لگتا ہے گلی کے جلوؤں کے علاوہ بھی بہت سارے جلوے اس کی نظروں میں بسے ہیں۔

دونوں رُخ بودو کا نیں ہیں، لیکن اس کی آنکھوں کے بھرے بھرے جلوؤں کے درمیان، ان سامنے کے جلوؤں کی کوئی رسائی نہیں ہے۔ پھر بھی جب رکشا گزرتا ہے تو وہ کنارے ہو جاتا ہے اور جب کار کی ہیڈلائٹ نظر آتی ہے تو اس کی نگاہیں قدموں کے نیچے مرکوز ہو جاتی ہیں۔

اس کے پیچھے لڑکوں کا ایک ہجوم ہے۔ یہ وہ لڑکے ہیں جنھوں نے کبھی بھی کسی آشفتہ حال کو بخشا نہیں ہے۔ ہجوم تالیاں بجاتا ہوا، واہی تباہی بکتا ہوا، کچھ ہاتھوں سے اشارہ کرتا ہوا، کسی کسی موقع پر اس کے آگے بھی آجاتا ہے، لیکن وہ بے حد صلح پسندانہ انداز میں اسے ایک طرف ہٹا دیتا ہے۔

یعنی یہ کہ وہ کہیں رُکتا نہیں ہے۔

اس کے جسم پر —

بس یوں سمجھیے کہ کان میں اس نے دس کے نوٹ کی ایک سلائی بنا کر اُڑس لی ہے، اور آنکھوں میں اتنے سارے مناظر بسالئے ہیں کہ ان کے بوجھ تلے سامنے کے مناظر دب سے گئے ہیں۔

جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

چند ایک احباب جو ہر شام گلی کے ایک خاص پوائنٹ پر ملتے ہیں اور مقامی اور بیرونی سیاست، حالات حاضرہ، کھیل کود اور فلم پر تبادلۂ خیال کیا کرتے ہیں، اُسے دیکھ کر چونک سے جاتے ہیں۔

اور وہ ہے کہ اس کے کان میں دس کے نوٹ کی ایک سلائی پھنسی ہوئی ہے اور بس۔ اس کے علاوہ اس کے جسم پر دنیا نام کی کوئی شے نہیں ہے۔

"نیا نیا انقلابی نظر آتا ہے۔"

"ہر طرف جنگل ہی جنگل بسے ہیں۔"

"طبی اصول سے یہ طریقہ صحیح ہے۔"

لیکن وہ کسی بات کا نوٹس نہیں لیتا ہے، لگتا ہے اگر اس نے ذرا بھی ادھر توجہ دی تو سارا کیا دھرا خاک میں مل جائے گا۔ بس وہ ہے اور اس کا تماشا کہ جیسے وہ ہتھیلی پر سلگتا چلا جا رہا ہے۔

اس کی چال میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دیتی اور صاف صاف یہ محسوس ہوتا ہے کہ

یہ شخص زندگی بھر اسی چال سے چلتا رہا ہے۔ نہ کوئی نمایاں تیزی نہ کوئی نمایاں سستی۔
لوگ دوکانوں سے سر نکال کر اسے دیکھتے ہیں، اور پھر کوئی فقرہ چست کر کے سر اندر کر لیتے ہیں۔
"دیوانہ نہ بھی ہو تو یہ دیوانگی ہے"

ہر دو چار قدم پر لڑکوں کی ایک نئی ٹولی ہجوم سے آملتی ہے۔
کچھ [illegible] بازار سے یوں گزر رہے ہیں، ابھی نیند [illegible]
[illegible] ہیں اور [illegible] اس منظر [illegible] کے سبب تماشائی بنے ہجوم
کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔
ہجوم کی ایک ٹولی اگر بلی کی میاؤں میاؤں کرتی ہے تو دوسری کتے کے بھونکنے کی صدائیں بلند
کرتی ہے۔
لیکن وہ شخص ان باتوں سے قطعی بے پرواہ سا ہے۔ اس کی آنکھیں گلی میں ہونے کے باوجود گلی
سے دور ہیں اور اس کے کان گلی میں ہونے کے بعد بھی گلی سے کالے کوسوں دور دکھائی دیتے ہیں۔
اب وہ سڑک کے قریب آگیا ہے۔ سڑک پر چونکہ دو طرفہ سواریوں کا رواج ہے، اس لئے بسوں،
اسکوٹروں اور کاروں کا سلسلہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں ہے۔ ایک طرف سے اگر گاڑیوں کا سلسلہ رک سا
جاتا ہے تو دوسری طرف سے سواریوں کی یورش شروع ہو جاتی ہے۔ سڑک پر روشنی کا سیلاب ہے۔ اس
سیلاب میں بہتے ہوئے لوگ اس کے قریب آتے ہیں اور پھر دور بہ کر غرق ہوتے ہیں۔
چیختے چیختے کسی نے کہا۔ "کوئی اللہ کا بندہ اس پر کرم کرتا!"
اس پر ہجوم نے ایک زبردست نعرہ بلند کیا۔
لیکن اس نے تو جیسے ہجوم میں تنہا رہنے کا فن سیکھ لیا ہے۔ اسے اپنے اوپر پورا اعتماد ہے۔
لگتا ہے وہ جو کچھ بھی کرے گا اپنے ارادے سے کرے گا، دوسرے کسی کا شور ماننے کو وہ قطعی تیار
نہیں ہے۔

جب بھی گاڑیوں کا تانتا کچھ سست پڑ جاتا ہے تو لڑکے ایک ساتھ شور مچاتے ہیں ——
"پار کر جا استاد"

لیکن وہ دونوں جانب اس طرح دیکھ رہا ہے، جیسے وہ خود اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ اسے کب سڑک پار کرنی چاہیئے۔

تب ہی بھاری گاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور سڑک پر صرف رکشے اور سائیکلیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے اس پندرہ بیس فیٹ چوڑی سڑک کو پار کر کے دوسری طرف چلا جاتا ہے۔

اِدھر بھی ہر موڑ پر اسے حیرت و استعجاب میں ڈوبے لوگ ملتے ہیں۔ لیکن وہ تو پتھر کی آنکھیں اور پتھر کے جسم و جان لے کر چلا ہے۔ فقروں کے پھینکے ہوئے تاثرات اور فقیروں کے پھینکے ہوئے جملوں کا اس پر کوئی ردِ عمل نہیں ہوتا۔

وہ ایک ایسا عمل ہے جو کسی بھی ردِ عمل سے مبرّا ہے۔

سڑک پار کر کے وہ اس منڈی میں داخل ہو جاتا ہے جس کے اگلے سرے پر پھل کی دکانیں ملتی ہیں اور ذرا آگے غلے کی دوکانیں۔

اگر اس کے پیچھے لڑکوں کا ہجوم نہ ہوتا تو شاید یہ منظر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں ناکام رہتا، لیکن لڑکے تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے اور ان کی ملی جلی آوازوں نے ایک خوفناک سماں باندھ دیا تھا، لگتا تھا اِدھر سے کوئی غول بیابانی گذر رہا ہے۔

پھل کی دوکانوں سے گاہک اسے پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے تو دوکانداروں کو یہ ڈر لگا کہ کہیں گاہک آگے نہ بڑھ جائیں۔ تب ہی انہوں نے اپنے گاہکوں کو کہا۔ "چھوڑیئے کیا دیکھ رہے ہیں، شہر ہے تو دیوانے بہت۔"

پر یہ کہ اس کی سماعت اور اس کی بصارت جو قریب ہوتے ہوئے بھی دور تھی اس سے یہی کہتی تھی کہ بس آگے بڑھے چلو۔

پھل کی دوکانیں ختم ہوئیں تو غلے کی دوکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

دو چار دوکانیں طے کر کے وہ ایک دوکان پر رک گیا۔

بنیئے نے ہجوم کو دیکھ کر کہا۔ "نیچے ہی رہو بھئی نیچے ہی رہو۔"

پھر وہ سارے گاہکوں کو چھوڑ کر خود ہی اس کے پاس آ گیا۔

"کل تک تو اچھے تھے۔"

اس نے چاول کا بھاؤ پوچھا۔ اور پھر تمباکو کے سفوف کو دانتوں میں دبا کر کان کے اوپر پھنسی دس کے نوٹ کی سلائی دیتے ہوئے ہنستے ہوئے کہا۔ "سب کے چاول دے دو۔"

دوکاندار نے کاغذ کے بڑے سے تھیلے میں چاول باندھ کر دیا اور کہا۔ "اب گھر جاؤ۔" جیسے وہ اپنے کسی عزیز کو یہ مشورہ دے رہا ہو۔

لڑکوں نے شور مچایا "جیت گیا بھئی جیت گیا۔"

واپسی کے سفر میں اس کے چہرے پر کچھ تاثرات آ گئے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ اس نے ایک مرحلہ سر کر لیا ہے۔

اگلے موڑ پر دوستوں میں گفتگو ہو رہی تھی۔

"اچھا تم نے اب دیکھا" ۔ "خاصا بھلا چنگا تھا جانے کیا چکر ہے۔"

"میرے سامنے کی بات ہے۔ ڈھابے والے سے اس کی بحث ہو رہی تھی۔ ممکن اور ناممکن ۔ تب ہی اس نے کہا دکھا دس کی تھی ...."

سڑک پار کرنے میں اسے حسب معمول کچھ دیر لگی۔

آتے جانے والوں کی نظریں اس پر گڑ جاتیں۔

"اسے کیا غم ہے۔"

"کوئی تو اس سے پوچھے۔"

جب وہ اپنی گلی میں داخل ہو گیا تو لڑکوں نے زوردار نعرہ لگایا۔

"جیت گیا بھئی جیت گیا۔"

کسی نے کہا! نعرے تو یوں لگا رہے ہیں جیسے کوئی سورما جا رہا ہے!

وہی لڑکے جو اب تک کتے اور بلیوں کی آوازیں بلند کر رہے تھے۔ گالیاں بک رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ اب تحسین آمیز نعرے لگا رہے تھے۔

تب ہی ایک لڑکے نے نعرہ بلند کیا۔ "ننگا بابا جیت گیا۔"

دوکانداروں نے اسے واپس جاتے دیکھا تو کہا۔ "اچھا! اچھا یہ معاملہ تھا۔"

کسی شخص نے دس پیسے یعنی ایک چار آنے کا ہار خرید کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اس نے اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے ہاتھ میں چاول کا تھیلا جو تھا۔

ڈھابے میں پہنچ کر اس نے آواز لگائی۔

"لو خاں صاحب میں آ گیا۔"

ڈھابے والے نے کہا۔ "ہاں جی استاد تم بڑے دم دار نکلے۔"

وہ ٹکر اور تہبند رکھ کر ڈھابے کے پیچھے والی کوٹھریا میں چلا گیا۔ وہاں سے واپس آ کر اس نے اطمینان کی ایک بھرپور سانس لی جیسے وہ آبادیوں میں واپس آ گیا ہو۔

تب ایک ایک کر کے بچے اپنے گھر کو روانہ ہو گئے۔

۱۹۷۷ء

اس کے بعد ہمارا ارادہ تھا کہ پلیا پار کر کے چڑیوں کے جال کی طرف چلیں گے کہ راستے ہی میں ایک موڑ پر ہمیں ایک بورڈ نظر آیا۔ "آدمی"۔

بورڈ پر ہاتھ کے اشارے سے راستے کی سمت بنی ہوئی تھی۔

'آدمی' کا بورڈ دیکھ کر ہمیں سخت حیرت تھی۔ گڈو بھی بار بار پوچھ رہا تھا کہ یہ کیا کسی اور طرح کا آدمی ہے۔

ہم جواب کیا دیتے کہ ہم نے خود بھی اُسے نہیں دیکھا تھا۔

موڑ نگ کچی پتلی سڑک پر کچھ دور جا کر ہمیں 'آدمی' کی قیام گاہ مل گئی، اور جس طرح دوسرے مقامات پر بورڈ لگے تھے، اسی طرح 'آدمی' کے یہاں بھی ایک بورڈ نصب تھا جس میں اس کا مکمل تعارف ملتا تھا۔

——— یہ ہزاروں سال پرانے آدمی کی نسل سے تعلق رکھتا ہے، اور آج بھی (اس کے آگے ہندی کی تحریر کو کسی نے کھرچ دیا تھا)۔

——— یہ صرف گوشت کھاتا ہے۔

تب ہی ہم اس کٹہرے کے قریب پہنچ گئے، جس کے نیچے ایک گہری کھائی تھی، اور جس سے کوئی اٹھارہ فیٹ کے فاصلے پر سڑک کی سطح کے برابر ایک بڑا سا زمین کا حصہ تھا، جس کا فرش پکا تھا۔ اس زمین پر دو تین چھوٹے چھوٹے کمرے نظر آئے، جن میں اوپر سے سلاخوں والے دروازے گرانے کا سسٹم تھا۔

گڈو نے کہا۔ "پاپا اسی طرح تو بن مانس اور شیر بھی رہتے ہیں۔"

آدمی کہیں نظر نہیں آیا، تو بچوں کے ایک گروہ نے جو دیر سے ہم لوگوں کے ساتھ گھوم رہا تھا، شور مچایا۔ "آدمی کہاں ہے؟" ———

تب ہی ان کے اسکول کے ایک ماسٹر جی نے جو وقتاً فوقتاً اسکول سے بچوں کی ٹولیاں لایا کرتے تھے، انہیں چپ کراتے ہوئے کہا۔

"ابھی وہ کھانا کھا رہا ہے، ذرا صبر کرو۔"

اتنے میں ایک آدمی ننگے بدن، گرد اور میل میں اٹا، کمرے سے برآمد ہوا۔ اس نے جسم کے

جسم کو کسی درخت کے بڑے بڑے پتوں سے ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے بال کی لٹیں جو بے حد گرد اور مٹی کے سبب رسیوں کی طرح بٹ گئی تھیں، اُس کی پیٹھ پر جھول رہی تھیں۔ داڑھی اس کی ناف تک پہنچی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے اور ناخن بے طرح بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں کسی جانور کی کھال ادھڑی ہوئی ٹانگ تھی، جسے وہ دانت سے نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک عورت بھی کم و بیش اسی حلیے میں نکلی۔ اس کے ہاتھ میں بھی گوشت کا ایک لوتھڑا تھا جسے وہ دانت سے کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھی۔

گڈو نے پوچھا — "پاپا وہ پکا کے کیوں نہیں کھاتا؟"

اور پھر تو اس نے اَن گنت سوال کر ڈالے۔

— "یہاں چڑیا خانے میں کیوں رہتا ہے؟"

— "ننگا کیوں رہتا ہے؟"

— "کپڑے کیوں نہیں پہنتا؟"

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ گڈو کے سوالوں کا صحیح جواب دینے سے میں یکسر قاصر تھا۔

اُدھر اسکول کے بچوں نے ماسٹر جی کا حلقہ بند کر لیا تھا۔

"...... درخت اس لیے نہیں ہیں کہ آدمی کے اس جوڑے نے ایک بار درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی تھی" ماسٹر جی بول رہے تھے۔

"...... اس کے بعد وہ یہ بھی کر سکتے تھے کہ جہاں وہ ہیں وہاں سے اس کٹہرے تک، کھائی کے اوپر درخت کا پل بنا لیتے اور آسانی سے ادھر آ جاتے۔"

اچانک ماسٹر جی نے ایک زوردار بانگ لگائی — "بچو سرک جاؤ۔" مرد نے بچی ہوئی ٹانگ کی ہڈی ہم لوگوں کی طرف اُچھال دی تھی۔

سچ پوچھیے تو بچے، ہم بڑوں کو بھی سخت حیرت تھی کہ صبح سے دوپہر ہونے کو آئی، کسی جگہ بھی ہمارے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک نہیں کیا گیا۔

لیکن وہ تو ہم لوگوں کو دیکھ دیکھ کر خوفناک قہقہے بلند کر رہا تھا۔

ماسٹر جی بتا رہے تھے "...... جس زمین پر یہ جوڑا بیٹھا ہے، پہلے وہاں پتھر بچھے تھے، لیکن جب ان لوگوں نے اپنے ناخنوں سے پتھر ہٹانے شروع کر دیے تو منتظموں نے پوری زمین پکی کرا دی۔ اب وہ اس فرش کو توڑ نہیں سکتے۔"

گول قطعہ زمین کے چاروں طرف کنارے کنارے شیشے کے ٹکڑے لگے تھے۔

"...... یہ اس لیے لگائے گئے کہ انہوں نے دو ایک بار نیچے اترنے کی کوشش کی تھی۔"

"...... کھائی کی دیواروں کا چکنا پن دیکھتے ہو؟ ــ پہلے یہ دیواریں کچی تھیں، لیکن جب انھوں نے نیچے اترنے کی کوشش کی تو یہ دیواریں بھی پکی اور سپاٹ کرا دی گئیں۔"

کھانے کے بعد وہ جوڑا کٹہرے میں چلا گیا۔

اسی اثنا خاکی وردی میں ملبوس، چڑیا خانے کا ایک ملازم ادھر سے گزرا تو ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

"ان کے لیے اندر پانی کا حوض بنا ہوا ہے۔ یہ حوض میں منہ ڈال کر پانی پیتے ہیں۔"

بچوں نے خاکی وردی والے کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ایسا واقف کار انھیں پھر کہاں ملتا۔

"...... کپڑے ہمیشہ دیے جاتے ہیں، لیکن یہ انھیں پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔"

"...... کچے گوشت کو تو منہ نہیں لگاتے۔"

جب وہ جوڑا پانی پی کر باہر نکلا تو اس نے کچھ ایسی حرکتیں شروع کر دیں، جنھیں بچے تو پورے طور پر سمجھ نہیں پائے، لیکن بچوں کی موجودگی میں بڑوں کی آنکھیں جھک گئیں۔

تب ہی وہ جوڑا ہمارے قریب آ گیا۔ مرد نے ہوا میں تیزی سے اپنے ہاتھ لہرائے اور کچھ ایسی دوہری تہری آوازیں اپنے حلق سے نکالیں جو "ژ"، "شش" اور "ف" سے ملتی جلتی تھیں۔

پاس سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ان کے سارے جسم پر بڑے بڑے کھردرے بنے تھے۔

بچے ڈر کر آپس میں گتھ گئے۔

ماسٹر جی نے کہا ــ "لگتا ہے وہ کہہ رہا ہے کہ تم لوگ بھاگ جاؤ، لیکن بچو، ڈرنے کی ضرورت

نہیں وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

ہم اس ٹیکرے سے لگے کھڑے تھے جس کے نیچے ایک گہری کھائی تھی اور جس سے کوئی اٹھارہ فیٹ کے فاصلے پر زمین کا ایک قطعہ تھا جس کے نیچے فرش پر وہ جوڑا بیٹھا تھا جو چڑیا خانے کی فراہم شدہ اطلاع کے مطابق ایک ایسی انسانی نسل سے تعلق رکھتا تھا جو ہزاروں سال پہلے دنیا میں پایا کرتی تھی اور جو آج بھی......

ہماری سرحد ٹیکرے پر ختم ہو جاتی تھی۔ اس کی سرحد نوکیلے خیشوں سے شروع ہوتی تھی اور ان دونوں سرحدوں کے درمیان ایک گہری کھائی تھی ——

ماسٹر جی نے میری طرف دیکھ کر کہا ــ "تھوڑی عقل تو اور بھی مصیبت بن جاتی ہے۔"

گڈوے نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس کا یہ انداز بتا رہا تھا کہ وہ بے حد خوفزدہ ہے۔

میں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو کہا ــ

"چلو بیٹے تمہیں سور دکھاتے ہیں۔"

لیکن گڈوے نے خلاف توقع میری تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں پاپا اب گھر چلیں گے۔"

سنہ ۱۹۷۰ء

مکالمہ

ضعیف العمر قصہ گو نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

—— ہاں تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا وہ چشمہ ہنستا کھیلتا، خوشی کے شادیانے بجاتا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

سبھی جنگل کے باسی اور اس کے کنارے بسی آبادی چشمے کا پانی پی کر تازہ دم ہو جایا کرتی جہاں سے وہ چشمہ نکلا تھا، وہاں سے کچھ دور، آگے جا کر نیچے کی سطح پر بہا کرتا۔

ایک دن کا واقعہ ہے......

اس تمہید کے بعد جب قصہ گو نے یہ جملہ چھیڑا تو سننے والے ذرا اور سمٹ آئے کہ گویا اب دریا میدانوں میں اُتر آیا ہے اور بات آگے بڑھے گی۔

—— تو یہ ہوا کہ اس دن اوپر کی جانب ایک شیر چشمے کا پانی پی رہا تھا۔ جب وہ جی بھر کر پانی پی چکا تو اس نے آس پاس کے ماحول اور دور دور تک پھیلی ہوئی فضا کو اپنی آنکھوں میں بسایا۔ اس درمیان اس نے کئی بار اپنی گردن کے بدلے، کئی بار اپنی آنکھوں کو سمیٹا اور پھیلایا۔ اور تب ہی ایک

منظر اس کی آنکھوں کو ایک نئی چمک دے گیا۔

جہاں وہ شیر کھڑا تھا، اس سے کچھ فاصلے پر نشیب کی طرف ایک میمنا چشمے کا پانی پی رہا تھا۔ چشمے کا حیات بخش پانی، دور دور تک پھیلی ہوئی فرحت بخش فضا اور اس پر میمنے کی شکل میں ایک لذیذ نعمت ۔۔

دوسری ہی ساعت شیر کے دل میں ایک خیال آیا۔ وہ ماتحتوں سے بات چیت کے طور طریقوں سے بخوبی واقف تھا۔ جو فعل اس کے لئے صحیح ہو سکتا ہے وہ اس کے ماتحتوں کے لئے غلط ہو سکتا ہے، اور جو ان کے لیے صحیح ہو سکتا ہے وہ شیر کے لئے غلط ہو سکتا ہے۔ حکمرانی کے کچھ آداب تھے جو اس کے خون میں رچ بس گئے تھے۔ تب ہی شیر نے گرجتے ہوئے کہا۔

"ابے چھوکرے تیری یہ مجال کہ اس پانی کو گندہ کرے جسے میں پیتا ہوں۔ تو نے یہ نہیں دیکھا کہ تجھ سے کچھ ہی دور پر میں بھی اس چشمے کا پانی پی رہا تھا"۔

میمنا کانپ اٹھا اور اس نے بڑی مشکلوں سے خود کو یکجا کر کے کہا۔

"حضرت سلامت! آپ اوپر ہیں اور میں نیچے ہوں، چشمے کا بہاؤ اوپر سے نیچے کی طرف ہے ایسے میں بھلا میں آپ کا پانی کس طرح گندہ کر سکتا ہوں"۔

سننے والوں میں سے کسی نے کہا۔ "شیر اور میمنے کی منطق کا فرق واضح ہے۔"

اس پر قصہ گو نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں ان سے کہا کہ وہ قصے کے درمیان کسی قسم کی رائے زنی سے پرہیز کریں، ورنہ وہ قصہ بھول جائے گا۔

—— ہاں تو پھر شیر کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ اس کا چہرہ کچھ اور بڑا ہو گیا اور اس کا قد کچھ اور کھنچ گیا۔

اور جب وہ زور سے دھاڑا تو ساری فضا تھرا اٹھی، لیکن دوسری ہی ساعت یہ محسوس ہوا کہ فضا نے اپنا دم سادھ لیا ہے۔ یہی حال میمنے کا بھی تھا۔

شیر نے کہا ۔۔ "ٹھہر تجھے تیری گستاخی کا مزہ چکھاتا ہوں۔ تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مجھ سے اس جنگل کے پنچھی پکھیرو، چھوٹے بڑے جانور اور پیڑ پودے کس طرح بات کرتے ہیں"۔

یہ کہہ کر شیر نے نشیب کا رُخ کیا۔ میمنے کی اتنی ہمت کہاں کہ فرار کی سوچے، پہلے ہی شیر کی شان میں کافی گستاخی کر چکا تھا۔

میمنے کے جسم کا سارا خون اُس کے دل میں کھنچ آیا تھا اور وہ بڑی ہی معصومیت اور مظلومیت سے شیر کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن تم نے وہ کہاوت سنی ہوگی کہ گھوڑا اگر گھاس سے دوستی کرے تو کھائے کیا۔

چنانچہ شیر نے میمنے کی تکا بوٹی کر کے اُسے برابر کر دیا۔

سننے والوں کی صف سے ایک نوجوان کھڑا ہوا اور اس نے کھنکھارتے ہوئے کہا۔ "محترم بزرگ! یہ قصہ اس مقام پر ختم نہیں ہوتا، اس سے آگے بھی جاتا ہے۔"

قصہ گو جھنجلا اُٹھا۔ "بکتے ہو، یہی اس کا انجام ہے۔"

تب حاضرین کے بے حد اصرار پر نوجوان نے اس کے آگے کا قصہ بیان کیا۔

—— شیر میمنے کو ٹھکانے لگا کر اپنی جگہ واپس آیا تو اس نے چشمے پر منہ صاف کیا اور خوب سیر ہو کر پانی پیا۔

اور جب یہ سب کر چکا تو اپنی عادت کے مطابق اُس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا اور نشیب کی طرف نظر دوڑائی۔

نشیب کی جانب پھر وہی میمنا اسی جگہ کھڑا پانی پی رہا تھا۔

شیر غصے سے بے اختیار ہو کر گرجا۔

"تو پھر آ گیا چشمے کا پانی گندہ کرنے۔ تیری یہ ہمت۔"

میمنے نے وہی جواب دیا جو اس سے پہلے دے چکا تھا۔

"جہاں پناہ! پانی بلندی سے ڈھلان کی طرف آتا ہے، ڈھلان سے بلندی کی طرف نہیں جاتا۔"

چنانچہ اس بار بھی شیر اسی انداز سے نشیب پر آیا، اور اس نے میمنے کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی۔

تیسری بار بھی یہی ہوا ——

چوتھی بار بھی یہی ہوا ——

تب بار بار کے اس عمل سے ننھی نے اس پورے مکالمے کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا۔
اور جب وہ میمنا سامنے آتا، تو ننھی خود بول اٹھتی۔

"گستاخ! تجھ کو کیسے، تیری یہ مجال کہ میرے پینے کے پانی کو گندہ کرے؟"

پھر وہی ننھی میمنے کا بھی جواب دیتی۔

"جہاں پناہ! پانی بلندی سے ڈھلان کی طرف آتا ہے، ڈھلان سے بلندی کی طرف نہیں جاتا۔"

اس مکالمے کے بعد شیر اپنے مخصوص انداز سے نشیب کی جانب آتا اور میمنے کو چیر پھاڑ کر ٹھکانے لگا دیتا۔

پر اس جگت ننھی سے شیر کافی نڈھال ہو گیا تھا۔
اس کی آنکھوں کے آگے تتلیاں سی ناچ رہی تھیں، منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں، اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا!
تب قصہ گو نے سوال کیا۔

"میرے عزیز! یہ بتاؤ کہ پھر یہ قصہ ختم کہاں ہوتا ہے؟" ——

۱۹۷۸ء

———ٜ———

صُورت اک بے کیفی کی

آپ ہی سوچیے کہ صبح سے شام تک اگر آپ ایک ایسی تصویر دیکھتے رہیں کہ جس کی آنکھوں میں سیکڑوں مکڑیوں کا جہنم روشن ہو۔ ایک قدم آگے بڑھے اور اس کے پیلے غضوں نے آلیا۔ جس کے چہرے پر ایسی مہیب گھٹائیں اُمڈ رہی ہیں جو ایک عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔ جس کے پیراہن سرخ میں کبھی نہ بجھنے والی آگ کا جنگل بسا ہو اور جس کی پیشانی پر شکن در شکن جال سا بچھا ہو۔ تو پھر آپ کا کیا عالم ہوگا۔

ایسی صورت دیکھ کر آپ خوفزدہ ہوتے ہیں، جلتے ہیں کڑھتے ہیں ۔۔۔ کب یہ نیست و نابود ہو جائے، کب یہ فنا کی گھاٹ اُتر جائے۔ آپ نہ ان احساسات کا کوئی صحیح نام دے سکتے ہیں، اور نہ ہی بربادیوں کے سلسلے میں کسی خاص فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں ۔۔۔ بس یہ کہ کسی طرح وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب صبح تا شام ایک ہی کمرے میں رہنا ہو، اس عالم میں کہ ایک اہم گوشہ اس تصویر کے لئے مخصوص ہو تو آپ اس سے نظریں بھی نہیں چرا سکتے۔ آنکھیں بند کر کے

تو آپ کمرے میں چل پھر نہیں سکتے۔ یہاں تو یہ صورت تھی کہ ــــــ
اِک ذرا گردن اٹھائی دیکھ لی ـــ

میں نے اس مسئلے پر ایک آرٹسٹ دوست سے گفتگو کی، اور کئی ایک قسطوں میں اسے ساری بات بتا سکا کہ وہ غریب بھی پڑا بھاگتا دوڑتا سا آدمی تھا۔

میں نے آرٹسٹ سے کہا ـــ "تم نے اس کی آنکھیں دیکھیں؟ ـــ اس کا چہرہ دیکھا؟ ـــ اس کا پیرہن سرخ۔ اداس کی پیشانی ـــ اُف میرے خدا کتنی ہی متوازی لکیریں اس پر کھنچی ہیں ـــ

آرٹسٹ نے کہا ـــ "ہر ایک لکیر دس سال کی نشانی ہے۔"

میں نے کہا ـــ "ہوش میں ہو، اسے وہ ہزار ہزار سال کی نشانیاں ہیں ـــ خدا کی پناہ۔"

ـــ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا ـــ "تم ضرورت سے زیادہ خائف ہو۔"

نہایت رد و قدح کے بعد بالآخر یہ طے پایا کہ آرٹسٹ کئی نشستوں میں اس کام کو پورا کرے گا، اور اس عجیب تصویر سے ایک قابل قبول صورت نکل آئے گی۔

آرٹسٹ اکثر وقت نکال کر آجاتا، اور ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس تصویر کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

تصویر۔ رنگ، قلم اور برش۔

اس درمیان میں اپنی دنیا میں گم رہتا۔ آرٹسٹ تصویر کی گرم آندھیوں کو برآمد کر کے اس کے اندر صبا کی مست خرامی آباد کرنا چاہتا تھا۔

دیر تک وہ تصویر میں ڈوبا رہتا اور تب وہ ٹھنڈی سانس لیتا، جیسے دفتروں میں لی جاتی ہے، جب آدمی تھک کر کام دوسرے دن کے لئے اٹھا دیتا ہے۔

آرٹسٹ میرے قریب تپائی پر آکر بیٹھ جاتا۔ وہ پیکٹ سے سگریٹ نکال کر منھ میں دباتا، لمحہ بھر ایک خاص انداز سے جلا کر، میری طرف دھواں پھینکتے ہوئے کہتا۔

"اب کسی اور دن آؤں گا۔"

اُس دن میں نے تصویر کو دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ موسم کچھ بدلا ہے لیکن میرے دل نے مجھے جھٹلاتے ہوئے کہا۔

"دراصل تم اب ان بیتے موسموں کے عادی ہو گئے ہو۔"

آرٹسٹ کو جب کبھی موقع ملتا وہ آجاتا اور ادھر اُدھر کی رسمی بات چیت کے بعد تصویر کو درست کرنے میں لگ جاتا۔

تب ایسا ہوا کہ اگر میرا دل کہتا کہ یہ خزاں کا نشان ہے کہ تصویر سرد مہری ہو گئی ہے تو میں تھکا سے اس بات کو غلط ثابت کر دیتا کیونکہ مجھے یہ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ بلاخیز موسم تیزی سے گذر رہا ہے اور اب کوئی دم میں ٹھنڈی ہواؤں کے قافلے بس آیا ہی چاہتے ہیں۔

پھر ایک دن آرٹسٹ نے اعلان کیا کہ آج اس کا کام ختم ہو گیا۔ اس کے چہرے پہ فتح مندی کا احساس جھلک رہا تھا۔

اُس نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "اب ذرا اس تصویر کی طرف دیکھو۔"

میں نے تصویر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوش و خرم آبادیوں کا گیت ابھر رہا تھا۔ ماتھے پہ سنہری کرنیں چمک رہی تھیں، چہرے پر ایک روشن شہر جگمگا رہا تھا اور اس کے پیرہن میں سیکڑوں ستارے جھلملا رہے تھے۔

میں خوشی سے جھوم اُٹھا۔ "آرٹسٹ تم واقعی گریٹ ہو۔ تم نے بالآخر اس کے اندر کے شیطان کو نکال پھینکا۔"

مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ میں آسمانوں میں اڑا جا رہا ہوں۔ کبھی یہ کہ میں ایک تنہا کشتی پر کھڑا سرکش موجوں کے سینے پر تیزی سے بہتا جا رہا ہوں — ننگے پاؤں برفیلی سطح پر دوڑتا جا رہا ہوں۔

میری خوشی نے دراصل میرے اندر کبھی نہ مٹنے والی باتوں کی سرمستی بھر دی تھی۔

کئی دنوں تک مجھے اس کیف نے سرشار رکھا۔

لیکن جب یہ خوشی کی لہر گذر گئی اور میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو میں نے سوچا — میں بھی

کتنا دیوانہ ہوں — نہ میں ہوا پر اڑ سکتا ہوں، نہ اکیلے کشتی پر کھڑا سمندر کی بدمست لہروں پر بہہ سکتا ہوں، اور نہ ہی ننگے پاؤں برف کی سطح پر دوڑ سکتا ہوں —

خوشی کیا کسی معصوم خواہشیں رکھنے والے بچے کا نام ہے؟

یوں ہی تنہا رہنے کی خوشی روح کو مردہ بنا دیتی ہے۔

مجھے یوں لگا کہ پھر وہی بے کیفی مجھ پر غالب آتی جا رہی ہے۔

تب ایک دن عجیب ایک سانحہ سا پیش آیا۔ میری بیوی ایک پلیٹ میں کچھ سیب اور ایک چھری لے کر آئی اور اسے میز پر رکھ کر کچن میں چلی گئی۔

میں اپنے بستر پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ایک باب ختم کر کے میں نے کتاب نشان لگا کر رکھ دی اور میز پر رکھے سیب کی طرف متوجہ ہوا۔ اچانک میری نظر اس تصویر پر پڑی تو میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

اس کی آنکھوں میں پھر وہی چنگاریاں عود کر آئی تھیں۔ اس کے ماتھے پر پھر وہی صف در صف شکنیں کھڑی تھیں۔ اس کا پیرہن پھر اسی طرح سرخ ہو گیا تھا — اور اس کی آنکھیں اس چھری پر جمی تھیں جو سیبوں کے درمیان رکھی تھی۔

میری چیخ سن کر میری بیوی دوڑتی ہوئی آئی تو میں نے اس سے کہا۔

”آرٹسٹ آئے تو اس سے کہنا کہ یہ تصویر پھاڑ کر پھینک دے، اور اس کی جگہ ایک نئی تصویر بنائے۔“

”یہ تصویر کبھی نہیں سدھرے گی۔“

۱۹۷۰ء

———•———

قربت کی دُوری

یوں لگتا تھا کہ ہر بار جب وہ اپنی آنکھوں کو کچھ اور سمیٹ لیتا تھا، تو وہ دس سال پہلے کے عہد میں چلا جاتا تھا۔ کئی بار کے اس عمل نے اسے بالآخر تیس سال پہلے کے زمانے میں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر لا کر کھڑا کر دیا۔

ہم ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے۔

"انشاء اللہ جلد ہی ملیں گے"۔۔۔

اس طرح ہم تیس سال بعد ایک، میرے شہر میں بغل گیر ہوئے، جو اب اس کا شہر تھا اور جہاں میری حیثیت ایک مہمان کی تھی۔

وقت نے اس سے بہت کچھ چھین لیا تھا۔ اس کے دانت، اس کی آنکھیں، اس کی آواز اور اس کی شعلگی۔۔۔

میرے باب میں سامنے کی دنیا کس قدر مضبوط تھی، لیکن اگر ہم دونوں ایک دوسرے کی من کی دنیا میں داخل ہوتے تو میرے یہاں زیادہ بربادی اور زیادہ شکستگی کے آثار ملتے۔۔۔

لیکن اس کا مجھے پہچان لینا واقعی حیرت انگیز تھا کیونکہ میں تو اس کے دفتر میں اس سے ملنے گیا تھا' اور مجھے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اشفاق کا نام لینے پر جو شخص مجھے اس دفتر میں ملے گا' وہ بجز اس کے اور کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔

پر اُسے تو میری کوئی خبر نہیں تھی' اس کے باوجود چشم زدن میں کئی چھلانگیں لگا کر اس نے مجھے بالآخر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر دریافت ہی کر لیا۔

مجھے اس کی یادداشت اور اس کی ذہانت پر خوشی ہوئی۔

"چلو اگر دل اور دماغ ساتھ دیتے ہیں' تو یہ چہرہ مہرہ تو محض ظاہری چیزیں ہیں۔"

اب ہمارے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ گفتگو کہاں سے شروع کی جائے کیونکہ ہمارے پیچھے تین دہائیاں منہ چھپائے کھڑی تھیں۔

"تم کیسے رہے؟"

"نیاز کہاں ہیں؟"

"بچے کیسے ہیں؟"

میرے ہر سوال کا اس نے مختصر سا چپا تلا اور رسمی انداز کا جواب دیا۔ پھر دوسری ہی ساعت وہ میرے دوست کی طرف متوجہ ہو گیا کہ اس سے اس کا مہینے چھ ماہ کا فاصلہ تھا' یوں کہ دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے' اور چونکہ وہ شہر ہر وقت جاگتا رہتا تھا' اس لئے ملاقاتیں نصف سال بعد' سال بھر بعد' اور کبھی کبھی کئی کئی سال بعد ہوا کرتی تھیں' اور وہ بھی لمحوں کے حساب سے' کیونکہ جلد ہی وقت انھیں ٹھوکے لگانے لگتا۔

"ہو چکیں باتیں اب آگے بڑھو۔"

مگر یہ کہ میرے دوست اور اس کے مابین جو رشتہ تھا' اس میں ایک تسلسل کا احساس ہوتا تھا' وقت کی کڑیاں ایک دوسرے سے جڑی نظر آتی تھیں۔ میرے ساتھ یہ تھا کہ ایک طویل مدت کی خلیج نے میرے اور اس کے درمیان کسی طرح کے بھی تسلسل کو یکسر ختم کر دیا تھا۔

ایک دہائی پہلے کی باتیں۔ دو دہائی پہلے کی باتیں۔ تین دہائی پہلے کی باتیں ـــــ اور یہ باتیں

تو اسی وقت ممکن تھیں، جب ہم نہایت یکسوئی سے بیٹھتے، اسے بھی فرصت ہوتی اور مجھے بھی فرصت ہوتی، لیکن اس بے قرار سے شہر میں کیا یہ سب کچھ ہو سکتا تھا۔

لیکن میں نے سوچا، اُس نے آنکھوں کے کئی زاویے بدل کر مجھے پہچان لیا، اس طرح گویا ایک پرانے رشتے کی تجدید ہو گئی۔ اب جب کبھی ہم اطمینان سے بیٹھیں گے تو پھر باتیں ہوں گی۔

تب میں نے اُسے اپنے دوست سے تقریباً چھینتے ہوئے کہا۔

"جانتے ہو یہ جو تمہارا پتہ میری ڈائری میں درج ہے، اسے کوئی بیس سال پہلے تمہارے ماموں نے مجھے دیا تھا۔"

اس نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ "میں بھی تمہیں کبھی نہیں بھولا۔ یقین نہ آئے تو اپنے دوست سے پوچھ لو۔" دوست نے گردن ہلا کر اس کی باتوں کی تصدیق کر دی۔

"اور ہاں تمہارے ماموں ......" میں نے اُس کے ماموں اور ان کے خاندان کی ایک مختصر سی روداد اسے سنا دی کہ وہ سب میرے ہی شہر میں رہتے تھے۔

میری باتوں کا اس نے کوئی خاص تاثر نہیں لیا۔ تب میں نے سوچا۔

"وقت بڑا قاتل ہوتا ہے، وہ رشتے ناطے کے درمیان بھی دیواریں حائل کر دیتا ہے۔ کیا اپنے حقیقی ماموں کی بدحالی کا ذکر سن کر محض ایک بے تعلق سا "اچھا" اسے زیب دیتا تھا؟"۔

میں نے اُسے اپنا "جیلانی منزل" والا پتہ دیا تو اس نے بچھڑتے ہی کہا۔

"آفاق تو ادھر اکثر جاتا رہتا ہے"۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا۔ "میں نے حج سے واپس آ کر دوسری شادی کر لی تھی، یہ کوئی ستائیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔"

اس کے بعد اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی اور کچھ دیر کے لئے سگریٹ کے دھوئیں میں کھو گیا، اِدھر میں اس کے خدوخال اور اس کے گرد و پیش کی ایک تصویر اپنے ذہن میں بناتا رہا۔

اشفاق احمد جو تین دہائیاں پہلے مجھ سے جدا ہوا تھا، اب ایک نئے شہر میں رہتا ہے، بظاہر تو ٹوٹا ٹوٹا سا دکھائی دیتا ہے، لیکن بہ باطن خاصا مستحکم ہے ــــ اپنا گھر ــــ بال بچے ــــ اور ابھی

یہ بات پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ اس کے اندر مٹی کی چنگاریاں ساری کی ساری بجھ چکیں یا ابھی دو چار روشن ہیں۔

سگریٹ سے فراغت پا کر اس نے اپنی جیب میں میرا پتہ رکھتے ہوئے کہا ـــ

"اچھا تو میں جلد ہی تمہارے یہاں آؤں گا۔"

ایک دن میں باہر سے آیا تو معلوم ہوا کہ وہ دیر سے میرا انتظار کر رہا ہے۔

"تمہیں یہاں آنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی" میں نے اسے شکر گذار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں میں بڑی آسانی سے سرکلر ٹرین پر بیٹھ کر یہاں آ گیا۔"

وہ دیر سے بیٹھے رہنے کے باوجود مجھ سے زیادہ تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ روزے کے دن تھے۔ اسے کسی ٹھنڈے یا گرم کے متعلق پوچھنا یقینی خلاف تہذیب تھا، پھر بھی میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

اُس نے کہا ـــ "میرا تو روزہ ہے، اور تم تو اس شہر سے آئے ہو جہاں ......"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ـــ "وہاں اب بھی سب کچھ ثابت و سالم ہے ـــ ویسا ویسا۔"

پھر میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس عہد میں لے چلا جو ہم دونوں کا تھا۔

سمندر جیسی گنگا کے کنارے بسا ہوا مشرقی بازاروں والا الف لیلوی شہر ـــ اس کی پر پیچ گلیاں۔

ایک سمت آم کے باغات کہ جن کے درمیان تاڑ کے طویل القامت پیڑ محافظ بنے کھڑے رہتے ہیں۔

وہ بھی بڑی سرعت سے بندر روڈ، صدر، لالوکھیت اور سوسائٹی سے نکل کر میرے شہر میں، اپنے سابق شہر تک چلا آیا۔

اور آنکھوں میں چمک تو نئے جلوؤں سے بھی پیدا ہوتی ہے، اور پرانے جلوؤں کی بازیافت سے بھی۔

اچانک اسے کچھ یاد آگیا ۔
"ملا جی زندہ ہیں"۔
ایک ٹمٹماتا سا بلب ۔ دو چار لمبی میزیں، دو چار لمبی بنچیں ۔ کنارے ایک گندہ سا اسٹور اور باورچی خانہ، جس کی ایک الماری پر کچھ از کار رفتہ پلیٹیں، المونیم کے گلاس، پیالے اور چمچے سجے ہوئے۔ ایک طرف ایک تخت بچھا ہوا، جس پر کیش بکس سنبھالے بیٹھا کرتے ملا نذیر حسین پروپرائٹر "ہوٹل ملا نذیر حسین"۔

اشفاق کا کھاتہ کھلا ہوا تھا۔ تین چار آنے میں ایک کپ چائے کے ساتھ غنیمت سا کھانا مل جاتا تھا۔ مہینے کے آخری سرے پر اشفاق کھاتہ کھول کر اپنا حساب کرنے بیٹھتا تو کل بندرہ سولہ روپئے کی رقم بنتی۔ اس رقم کی ادائیگی کے بعد، وہ اپنے صفحے پر ایک بڑا سا کراس بنا دیتا اور پھر ایک نیا صفحہ کھول دیتا۔ ملا جی پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن ان لمحوں میں وہ بھی دل ہی دل میں کچھ حساب کرتے جاتے، اور بسا اوقات ایسا ہوتا کہ وہ اشفاق کے حساب سے مطمئن نہیں ہوتے تو اسے وہیں ٹوک دیتے۔

"اشفاق بابو حساب کچھ گڑبڑ ہے، پھر سے جوڑو"۔

امتحان کے دنوں میں اکثر رات گئے مختار بھائی رونی صورت بنا کر اعلان کرتے ۔

"دوستو آج کی رات ہم پر بہت بھاری ہے"۔

ہم چونک کر پوچھتے ۔ "وجہ مختار بھائی"۔

"اسٹوو میں ایک قطرہ تیل نہیں ہے، چائے کیسے پئیں گے ؟" (مختار بھائی کو پڑھنے لکھنے سے زیادہ چائے کی فکر رہا کرتی تھی) ۔

اور تب ہمیں غور و فکر کے بحر بے پایاں میں غوطے لگاتے دیکھ کر، اشفاق ایک زوردار نعرہ بلند کرتا ۔ "ملا جی زندہ باد"۔

ملا جی ہوٹل ہی میں سوتے تھے ۔ ہم رات کے سناٹے میں ان کا دروازہ کھٹکھٹاتے تو وہ وہیں سے ہانک لگاتے۔ "کیوں تنگ کر رہے ہو سونے دو"۔

"ملا جی اگر آپ نے دروازہ نہیں کھولا تو ہم ساری رات اسی طرح کھٹکھٹاتے رہیں گے بہتر یہ ہے کہ"

تب ملاجی بکتے جھکتے اُٹھتے۔ "تم لوگوں کو نیند نہیں آتی ہے؟ ۔ گھر میں تو کہنے والا کوئی بڈھا بڑھا نہیں ہے، جو اتنی رات گئے سنسان سڑک پر نکل آتے ہو؟"۔

اس پر مختار بھائی کہتے ۔ "ملاجی امتحان قریب ہے اور اگر چائے نہ ملی تو ہمارا جاگنا ناممکن ہو جائے گا"۔ حالانکہ ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ چائے پی کر مختار بھائی کو بڑی گہری نیند آتی ہے۔

اس کے بعد ملاجی کے بہانے شروع ہو جاتے ۔

"کوئلہ نہیں ہے"۔

"ہم اپنی ہڈیاں جلا دیں گے"۔

"شکر نہیں ہے"۔

"پھیکی بھی چلے گی"۔

"دودھ نہیں ہے"۔

"ہم تو کالی چائے کے رسیا ہیں"۔

"پتی بھی نہیں ہے"۔

اس پر ہم سب بیک آواز چیخ اُٹھتے۔ "ملاجی ایسا ظلم نہ کیجئے، ہم لوگ مر جائیں گے"۔

تب ملاجی پگھل جاتے۔ "تم لوگ نہیں مانو گے"۔

ہماری گفتگو کے دوران آتی 'CANARY' ۔۔ 'LONDON LAVENDER'

۔۔ سود اور رقبے کا حساب اور پھر چرچل کا قول آجاتا ۔

اشفاق کو کلچے بہت پسند تھے ۔ چنانچہ ان دنوں ہم لوگ کہا کرتے ۔

"ASHFAQUE SAYS KULCHA'S FALL IS OUR OWN" ۔۔

اور پھر آخر میں چائے آجاتی ۔

ملا نذیر حسین اور ان کا ہوٹل ۔۔ ان کا ملازم علی جان ۔۔ ہوٹل کے سامنے قلعے کی لال عمارت، جس سے اک ذرا پرے سُرخ مدشنی کا شہر آباد تھا۔

یادوں نے کہاں کہاں نہیں بسیرا لیا۔ اور جب میں ان پناہ گاہوں سے واپس لوٹا تو اس اجنبی شہر میں، میرے سامنے کے صوفے پر اشفاق بیٹھا نظر آیا۔

"تم نے ملاجی کے متعلق پوچھا تھا۔ اب تو ان کی قبر کا بھی نام و نشان نہیں ملتا جہاں ہوٹل تھا وہاں ایک بے حد پررونق سا مارکیٹ بن گیا ہے اور شب و روز بیوپاریوں کی یورش رہتی ہے۔"

اشفاق نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور چند ثانیوں تک خلاؤں میں گھورتا رہا اور پھر جب اس دنیا سے لوٹا تو اس نے اپنا احوال بیان کرنا شروع کر دیا۔

"آمنہ میڈیکل کے فائنل ایر میں ہے۔ اشتیاق اور آفاق انجینئرنگ میں ہیں، فلاں بی۔ اے میں ہے۔ اس کے بعد انٹر، ہائی اسکول اور ساتویں جماعت۔"

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اس کے بچے اچھا کیریر بنا رہے ہیں۔ لیکن میں نے سوچا، یہ تھوڑی دیر کا ملنا بے حد غنیمت ہے۔ اس وقت کو ہم ان بستیوں میں کیوں نہ گزاریں جو میری بھی تھیں اور جو اشفاق کی بھی تھیں ـــــ

"تمہیں ایک پیسے پیالی والی چائے یاد ہے؟" ـــــ

اس پر اس نے کہا۔ میں نے ہی تو تمہیں وہ چائے خانہ دکھلایا تھا۔ ماسٹر ریئس کے گھر کے قریب تھا۔" ـــــ

سردی کے دن تھے۔ الطاف صاحب ۷ بجے صبح اپنے گھر بلاتے۔ منھ اندھیرے ان کے گھر ٹیوشن پڑھنے والے لڑکوں کی بھیڑ جاڑ شروع ہو جاتی۔ ان کے یہاں حساب اور جغرافیہ پڑھ کر ہم گنیش شنکر جی کے یہاں چلے جاتے جو ہمیں انگریزی اور گریمر پڑھاتے تھے۔

یہ دونوں ٹیچر پیسے کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔ اشفاق نے کیا یہ کہ ایک دن پھٹے پرانے کپڑوں میں باری باری ان دونوں کے یہاں جا کر، نہایت دردناک لہجے میں اپنی بپتا چھیڑ دی۔

"ماسٹر صاحب میرے والد فوج میں سکنڈ لفٹننٹ تھے۔ خبر آئی ہے کہ وہ محاذ پر

مارے گئے۔ چونکہ میں گھر میں سب سے بڑا ہوں' اس لئے ان حالات میں میرا پاس ہونا بے حد ضروری سا ہے۔"

ان دونوں نے ترس کھا کر کہا۔ "اچھا تو کل سے آجانا' پیسے کا کچھ خیال نہ کرو۔"

ہم نے جب اسکول کے دوستوں کے سامنے اس راز کا انکشاف کیا تو لڑکوں پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ "کمال کر دیا بھئی اشفاق نے۔ یتیموں جیسی صورت بنا کر اس نے بڑے بڑے سنگدلوں کو رام کر لیا۔"

دراصل اشفاق کو ڈرامائی سچویشن پیدا کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

اور پھر ان ہی راہوں میں ہمیں ایک پیسے پیالی والی چائے مل جاتی تھی۔

اچانک ہمارے درمیان مختار بھائی کا ذکر چھڑ گیا۔

"مختار بھائی دراصل ہمارے دو بانو تھے' جو ایک حادثے میں کٹ چکا ہے۔" اشفاق کچھ جذباتی ہو گیا اور دیر تک اس حادثے کی تفصیلات پر گفتگو کرتا رہا۔

اتنے میں پڑوس کی مسجد میں عصر کی اذان ہونے لگی۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔ "پھر سیاست چھوڑ کر دائمی حصار دین میں ہو ـــــ اس لئے فی الوقت میرا مشورہ یہ ہے کہ تم نماز پڑھ لو۔"

ایک دن میرا دوست مجھ سے ملنے آیا تو باتوں ہی باتوں میں اس نے مجھ سے کہا۔

"چلو اشفاق سے مل آئیں۔"

اشفاق کالے کوسوں دور نیو کالونی میں رہا کرتا تھا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی لمبی ڈرائیو تھی۔

اشفاق نے اپنی بیوی سے ملایا۔ میری ڈاکٹر بیٹی تو اپنے چچا کے یہاں گئی ہوئی ہے۔ بڑے لڑکے کہیں سیر سپاٹے میں نکلے ہوئے ہیں۔ چھوٹے لڑکے پڑھ رہے ہیں۔

کبھی دونوں میاں بیوی پاس ہی پاس کی بستیوں کے رہنے والے تھے۔

بیوی نے دریافت کیا۔ "میری بستی کے متعلق آپ کو کچھ علم ہے؟"۔

میں نے کہا۔ "اب بھی وہاں بہت سارے ہم صورت آباد ہیں۔"

اس پر بیوی نے اشفاق کو گھور کر دیکھا۔

اس نے سرگوشیوں میں کہا۔ "کیا تم نے کہہ دیا، اب کل ہی سے ہنگامہ شروع کر دیں گی کہ میرے جانے کا انتظام کر دو۔"

پتہ چلا کہ اشفاق اب تک بیوی پر یہ تاثر دیتا رہا تھا کہ بستی ویران ہو چکی ہے، اور ہما شما شہروں میں بکھر چکے ہیں۔

بیوی کچن کی طرف گئی تو اس نے چپکے سے پوچھا۔

"ثمن کیسی ہے؟"۔

"ثمن یا چمبیلی؟"۔

میرا دوست ان ناموں سے واقف تھا اس لئے وہ زیر لب مسکرا دیا۔

اسے اتفاق ہی کہئے کہ ایک دن گھر بیٹھے بیٹھے ہم لوگوں کی نظر اچانک سامنے والے مکان کی کھڑکی پر جا ٹکی۔ کچن سے دھواں اٹھ رہا تھا، اور اس دھوئیں کے بیچ ایک لڑکی آنکھیں ٹمٹماتی جاتی تھی اور اپنے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔

میں نے اشفاق سے کہا۔ "اشفاق آج تک ہم لوگ کہاں رہے؟۔ ہماری بے خبری کا یہ عالم ہے کہ ہمیں یہ تک نہیں معلوم تھا کہ بہار سامنے کے مکان میں اتر آئی ہے۔"

کچھ دیر ہم لوگ کھڑکی سے لگے اس بہار کے جلوؤں میں کھوئے رہے۔

اتنے میں آواز آئی — "ثمن ادھر آؤ۔"

اشفاق نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو یہ آپ کا نام ہے۔"

میں نے کہا۔ "جی ہاں آپ ہی کا نام ثمن ہے۔"

پھر ہم نے اس معاملے کو مختار بھائی کے حضور میں پیش کیا۔

میں نے تو چپکے سے یہ کیا کہ اپنے اندر ایک قندیل جلا کر اپنے دل کو اس کی روشنی سے منور کر لیا۔

اشفاق آہیں بھی بھرتا اور دھیمے سُروں میں کچھ اشعار بھی پڑھ لیتا۔

لیکن مختار بھائی تو بہت تیز چلنے والے لوگوں میں تھے۔ انھوں نے تو کمال ہی کر دیا کہ ایک دن "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" والا شعر پڑھ گئے۔

ایک صبح کا واقعہ یہ ہے کہ ہم سب کھڑکی پر جھکے ہوئے تھے، اشفاق ہاتھوں سے کچھ اشارہ کر رہا تھا اور مختار بھائی اپنے سیدھے اشعار پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں دادا جان کمرے میں آ گئے، اور انھوں نے آتے ہی ہم سے استفسار کیا۔

"کیا کر رہے ہو تم لوگ؟"

"کچھ نہیں دادا جان وہ سامنے کی چھت پر بندر اچک پھاند کر رہا ہے۔"

"بھئی امتحان قریب ہے پڑھائی پر زیادہ دھیان دو۔"

ان کے جانے کے بعد دیر تک ہماری سانس قابو میں نہیں آئی۔ اور جب ہم ذرا سنبھلے تو ہم نے سوچا کہ اگر دادا جان کو حقیقت کا علم ہو جاتا، تو آج قیامت ہی برپا ہو جاتی۔

"اشفاق سلے، تم بھی نہیں بخشے جاتے، وہ جوتے پڑتے کہ آیندہ سے ٹھنڈی آہیں بھرنا بھول جاتے۔"

لیکن دادا جان کا خدمتگار رحمت علی بے حد چالاک تھا۔

ایک دن وہ بھی عین موقع پر پہنچ گیا، اور جب اس نے ہم سے دریافت حال کیا، تو ہم نے اس کو بھی وہی بتایا جو ہم دادا جان کو بتا چکے تھے۔

"چھت پر نہیں باورچی خانے میں تھا، اس کے بال اس کی کمر کو چھو رہے تھے، اس کی آنکھوں میں دیے جگمگا رہے تھے، اور اس کے چہرے پر کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔"

اشفاق نے کہا۔ "تیرا بیڑا غرق۔"

اور مختار بھائی نے کاغذ کاٹنے کی چھری اٹھاتے ہوئے کہا۔ "رحمت علی ہم تمہارا MURDER کر دیں گے۔"

رحمت علی کھی کھی ہنستے ہوئے کہا۔ "مار دھاڑ تو بعد میں کرنا، پہلے سرکار کے پاس چلو۔"

اس پر ہم تینوں نے بہ یک زبان کہا۔ "یار کیا بے مروت آدمی ہے، اس کی آنکھوں میں سور کا بال ہے۔"

رحمت علی دیر تک ہنستا رہا "تو پھر چھپاتے کیوں ہو؟"

اس حادثے کے بعد ہم لوگ CODE میں بولنے لگے، لیکن اسے بھی رحمت علی نے معلوم کر لیا۔ چنانچہ ایک دن جب اشفاق نے اس کے سامنے کہا۔ "دل میں چیمبن سی ہو رہی ہے"۔ تو اس نے اپنی مخصوص ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔ "چیمبن نہیں ٹُن ہو رہی ہے۔"

"یا خدا یہ تو نام تک جان گیا۔"

ان ہی دنوں مختار بھائی نے ہم لوگوں کے بھرپور تعاون سے ایک گرما گرم سا گمنام خط ٹُن کے نام لکھا۔ بہت سے عشقیہ اشعار چھان پھٹک کر نکالے گئے، انگریزی کی نظموں سے استفادہ کیا گیا، اور یہ لکھا گیا کہ عزدل کے مارے پر نزع کا عالم طاری ہے، اور اگر ٹُن سے کچھ بھی نہ ہو سکے تو وہ کم از کم اس خط کو چوم لے تاکہ مرنے والے کی روح عالمِ ارواح میں سکون پا جائے۔

اس خط کو مختار بھائی نے گھر سے دو ڈھائی میل دور ایک لیٹر بکس میں پوسٹ کیا تھا۔

جواب آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا، لیکن مختار بھائی کا خیال تھا کہ وہ بالیقین کچھ نہ کچھ گرم ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس خیال کے تحت ہی وہ ایک دن دفتر کے اوقات میں، یہ معلوم کرنے کے بعد کہ ٹُن کے والد دفتر جا چکے ہیں، اس کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو ٹُن نے دروازہ کھولا۔

اتنے میں ماں نے آواز دی "کون ہے ٹُن؟"

اس آواز کو سنتے ہی مختار بھائی جو ٹُن کو کلیجے سے لگا چکے تھے، وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ٹُن ——

چیمبن ——

اشفاق میرے سامنے بیٹھا تھا۔ "تمہیں یاد ہے ٹُن؟"——

درجن بھر بال بچے، درجن بھر پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں۔ باہر سے شکستہ حال لیکن اندر سے بے حد خوش۔ یہ رہی تمہاری ٹُن، جواب اکثر بے خطر میرے گھر آ جایا کرتی ہے۔ تھوڑی دیر

سناٹا سا چھا یا رہا۔ پھر اس خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے میرے دوست سے کہا۔

"میں نے اس کالونی میں ایک اور مکان بھی بنوایا ہے، جو کرائے پر لگا ہے۔"

"آمنہ میڈیکل کرلے تو اس کی شادی کر دوں گا۔"

"کئی بچے ایک ساتھ شادی کے قابل ہو گئے۔"

"ملا جی ہو گئے ۔۔۔ ماسٹر الطاف اور ماسٹر گنیش شنکر ہو گئے ۔۔ ختم ہو گئی۔"

"اب اور کون سا موضوع رہ گیا۔"

تب ہی میں نے ان کی باہمی گفتگو میں دخیل ہوتے ہوئے کہا۔

"جب بھی تمہاری بستی کی طرف سے گزرتا ہوں، میں اسے سلام کر لیتا ہوں۔"

"یاد ہے میں بھی ایک بار تمہارے گاؤں گیا تھا۔"

دور سے کوئی آواز دے رہا تھا ۔۔ دیکھو پگڈنڈی پر سنبھل کر چلنا۔"

نانی اماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں اشفاق کا دوست ہوں، تو انھوں نے بہت ساری دعائیں دی تھیں۔

پھر کچھ دنوں کے بعد یہ ہی کہ بستیاں بے ہنگم شور، دل ہلا دینے والے نعروں اور آسمان تک بلند ہونے والے شعلوں کی نذر ہو گئیں۔

کنویں سے ایک ضعیفہ اور اس کی نواسی کی لاش برآمد کی گئی۔ تمام خون کے دھبے ۔۔۔

بے نور سی آنکھیں ۔۔۔ چادروں اور بربادیوں کا ڈھیر۔ جلے مکانوں سے اٹھتا ہوا ہلکا ہلکا دھواں۔

اشفاق نے کہا ۔۔ "اب ہماری یادیں بھی اس بستی کی طرح جل چکی ہیں۔"

اس دن میں نے اُسے اور بھابھی کو بلایا تھا ۔۔

کافی انتظار کے بعد بھی جب وہ لوگ نہیں آئے تو میں کہیں باہر نکل گیا۔

واپس آیا تو نوکر نے کہا ۔۔ "وہ صاحب اور ان کی بیگم آئی تھیں۔ آپ کو نہیں پا کر صاحب تو کچھ نہیں بولے لیکن بیگم صاحبہ بے حد خفا تھیں۔" آخر بلایا ہی کیوں تھا۔"

میں نے خط لکھ کر اشفاق سے اپنی اس غلطی کی معافی مانگی۔ پھر کئی خط لکھے، لیکن نہ تو اس کا جواب آیا اور نہ ہی وہ خود آیا۔

میں بھی ملنے جلنے والوں میں اتنا الجھا رہا کہ اس کے یہاں جانے کا موقع نہیں نکال سکا۔

اور آج جب میں اپنے شہر کو واپس آچکا ہوں، تو سوچتا ہوں کہ اس کا یہی احسان کیا کم تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا اور کئی ایک بار مجھ سے ملنے آیا کہ میرا اور اس کا رشتہ تو محض یادوں کا رشتہ تھا۔

ویرانے کی جانب ایک سفر۔

۱۹۷۹ء

بستی ایک نئی ہے

سعید کے برابر والی کرسی پر اس کا پارٹنر بیٹھا تھا۔ میز پر ایک طرف فائلوں کا ڈھیر تھا۔ دوسری طرف موٹی سی ڈائریکٹری کے اوپر فون دھرا تھا۔ اور ان دونوں کے درمیان، قلمدان، سگریٹ کا پیکٹ، دیاسلائی اور ایش ٹرے۔

سعید کا پارٹنر کسی فائل میں منہمک تھا۔ لیکن سعید ہم لوگوں سے محوِ گفتگو تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس نے بعد اس کے پارٹنر سے اس نوع کا کوئی سمجھوتہ تھا کہ جب اس کے دوست آئیں تو سعید فائل دیکھے اور جب سعید کے دوست آئیں تو وہ ـــ

میں سعید کے سامنے بیٹھا تھا اور میری کرسی سے ملی ہوئی کرسی پر میرا دوست اور کبھی کا کھنڈرا عتیق بیٹھا تھا جو اب اس شہر میں نہایت ہی مغلوب الحال سا صوفی دکھائی دیتا تھا۔

ہماری گفتگو میں دو چیزیں بار بار حارج ہو رہی تھیں۔ ایک تو ہر دو چار ثانئے کے بعد فون کی گھنٹی اور دوسری دو منٹ کے بعد عتیق کی ٹھنڈی آہیں۔

عتیق کی ٹھنڈی آہیں لگتا تھا کہہ رہی ہوں ـــ "یہ دنیا بیکی دو ہی تین بس بھاگ چلو۔"

ایک میلی سی شیروانی، سر پر منڈھی ہوئی ایک میلی سی مخمل کی ٹوپی، اور پاؤں میں پیاوروں کی جوتیں۔

تب ہی سعید نے ہاتھوں کے اشارے سے مجھے برآمدے میں چلنے کو کہا۔

برآمدے میں پہنچ کر سعید نے کہا۔ "یار میں اپنے لڑکے کے لئے عتیق کی لڑکی کا رشتہ مانگنا چاہتا ہوں۔ اس نے اسی سال میڈیکل پاس کیا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "خدا مبارک کرے۔"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور سعید لپکتا ہوا فون کی طرف چلا گیا۔

سعید کا لڑکا سائنس گریجویٹ تھا، اور کسی دور کے شہر میں ایک بڑی فرم میں جونیئر اکزیکیوٹو کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، اور چونکہ غیر سرکاری دفتروں میں سرکاری دفتروں کی طرح ہر گلاس میں ایک تہائی دودھ کے ساتھ دو تہائی بالائی ڈالنے کا رواج نہ تھا، اس لئے وہ سرکاری دفتروں والے فیض سے محروم تھا۔ ویسے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ابھی بچہ ہے، دودھ سے کریم نکالنا بھی ایک مستقل فن ہے جو تجربے کی کئی منزلیں سر کرنے کے بعد ہی کسی کے ہاتھ لگتا ہے۔ سرکاری دفتروں میں تو کرسی سے اُٹھنے والا، کرسی پر بیٹھنے والے کے کان میں سب کچھ پھونک جاتا ہے۔

سعید آیا تو اس نے بتایا کہ وہ عتیق کو کل شام کی چائے پر بلا رہا ہے۔ مجھے بھی وہ میری قیام گاہ سے پک اپ کرے گا۔

دوسرے دن حسب وعدہ سعید مجھے لینے آگیا۔

راستے میں اس نے مجھ سے کہا۔ "یہاں زندگی بے حد پیچیدہ، دشوار ہو گئی ہے، تمہارے یہاں والی بات نہیں ہے۔ یہاں سب کچھ سوچنا پڑتا ہے۔"

عتیق بھی ہمارے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد وہاں پہنچ گیا تھا۔

چائے کے بعد میں نے سوچا کہ شاید سعید آج بھی مجھے کنارے لے جا کر یہ کہے کہ میں ہی یہ تجویز پیش کروں، ورنہ میرا بھلا یہاں کیا کام تھا، دونوں خود ہی بیٹھ کر سب کچھ طے کر سکتے تھے۔

ٹی۔وی پر ایک ڈرامے کی قسط آرہی تھی، مجھے اس میں یوں دلچسپی تھی کہ میں اس کی کئی قسطیں

پہلے دیکھ چکا تھا چنانچہ میں ٹی۔وی لاؤنج میں سعید کی بیوی اور بچوں کے ساتھ ڈرامہ دیکھنے بیٹھ گیا

اتنے میں سعید نے مجھے آواز دی تو میں لان میں ان کے پاس جا بیٹھا۔

تب ہی سعید نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "عتیق تم سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

عتیق نے دھیرے سے ٹھنڈی سانس لی اور سعید کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"تمہاری لڑکی سے میرے لڑکے کا رشتہ کیسا رہے گا، گھر کی بات ہے تمہیں کسی قسم کی پریشانی بھی نہیں ہوگی۔"

سعید کی اس پیشکش کے بعد میں نے سوچا تھا کہ مغلوب الحال عتیق 'اللہ بس باقی ہوس' کا نعرۂ مستانہ بلند کرے گا اور یہ کہے گا 'جو تیری مرضی سو میری مرضی'!

لیکن عتیق نے تو اپنی ساری وارفتگی کو پرے جھٹک کر بڑے سنبھلے ہوئے انداز میں کہا۔ 'یار تم نے کچھ دیر کر دی۔'

اچانک نغمہ زنی جو جاری تھی، ساکت سی ہو گئی اور ایسا محسوس ہوا کہ اب نہ کچھ سننے کو باقی رہ گیا ہے نہ بولنے کو۔

آگے کیا ہوگا؟ — اس مہرِ سکوت کو کون توڑے گا؟ —

تب عتیق ہی نے اس تعطل کو ختم کیا اور بتایا کہ اس کی بیوی کا ایک رشتے کا بھانجا، ڈاکٹر بننے کے بعد کسی اچھی جگہ پر کلینک کھول کر بیٹھ گیا ہے۔ اس کی ماں عتیق کی بیٹی کا رشتہ مانگنے کے لئے عتیق کی بیوی کے پاس آئی تھی اور یہ کہ اس کی بیوی نے تقریباً طے بھی کر دیا ہے۔

اس گفتگو کے بعد سیاست، ثقافت اور عالمی مسائل کی باری تھی۔

لیکن عتیق نے ہاتھ کے اشارے سے جیسے سعید کی رکتی سانس کو زینہ بہ زینہ اپنے اندر اتارا اور پھر اس کے بعد اپنی گفتگو کا ایک تازہ باب چھیڑ دیا۔

'ویسے سعید میں تمہارے آگے ایک اور تجویز پیش کرتا ہوں۔ ابھی تمہیں ایک اور لڑکی

بیاہنا ہے۔ میرا بڑا لڑکا انجینئر ہو چکا ہے، کیوں نہ تم اسے اپنی غلامی میں لے لو۔"

میں تو اپنے طور پر عتیق کی اس تجویز سے خوش ہو گیا، اور فی الفور میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اسے سن کر سعید کا چہرہ دمک اُٹھے گا، کیونکہ میرے یہاں تو یہ کہا جاتا ہے کہ "لڑکے کی شادی پل بھر میں رچا دی"۔۔۔ لیکن لڑکی کی شادی؟ ۔۔۔ جس نے لڑکی کی شادی کر دی، اُس نے تو گیا اپنے سینے کا پہاڑ اُتار پھینکا۔۔۔

لیکن سعید کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

اچانک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ مجھے بھی اس مسئلے پر کچھ بولنا چاہیے، آخر میں یہاں کیوں بلایا گیا تھا؟۔ اور اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنی کرسی ان کے قریب کر لی اور سعید اور عتیق کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوا۔

"سنو دوستو، ہم پر یہ ستم ٹوٹا کہ بہت سال پہلے۔ تیس سال، چالیس سال، پچاس سال، سو سال، حتیٰ کہ ہزار سال پہلے بھی کہہ دو تو کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ سبھی گذری ہوئی ساعتیں کالی اندھیری راہوں میں گم ہو جاتی ہیں ۔۔۔ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور تم جو میرے دست و بازو تھے مجھ سے بچھڑ گئے۔ یہ ملنا عارضی سہی، لیکن سچ کہتا ہوں کہ تمہیں یہاں پا کر میرے اندر یہ احساس جاگا ہے کہ یہ جو تھوڑا سا وقت تمہارے ساتھ بسر ہو رہا ہے اسے گوہر نایاب جان کر میں اپنے ساتھ لیتا جاؤں، اور جب زندگی میں اندھیری راتیں آئیں تو میں ان سیہ بخت راتوں کو ان دمکتوں کا نور بخش دوں۔"

اسی لمحے مجھے یہ محسوس ہوا کہ میری یہ گفتگو خاصی بے ربط اور بے محل سی تھی اور اس احساس کے ساتھ ہی میں نے اس گفتگو کو یکلخت تمت بالخیر تک پہنچاتے ہوئے ان سے کہا۔ "مجھے تم دونوں کی تجویز پسند آئی۔"

میری بات ختم ہوئی تو سعید نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔۔۔ "بہرحال عتیق ہم اس غیر ملکی کے سامنے یہ فیصلہ کر لیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی تجویز پر غور کریں گے۔"

اس پر عتیق نے ایک تھکے ہوئے راہی کی طرح، اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے نحیف آواز میں

کہا "ٹھیک ہے۔"

اس طرح شگفتگی لوٹ آئی اور اِدھر اُدھر کی باتیں چھڑ گئیں۔

اتنے میں عتیق نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی "کافی دیر ہو گئی اب میں چلوں گا۔"

تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سعید نے کہا "چلو میں تمہیں پہنچا دیتا ہوں۔"

ٹیکسی میں سعید کے برابر عتیق بیٹھ گیا، میں پچھلی سیٹ پر تھا۔ راستے میں ہی ایک جگہ گاڑی روک کر سعید کوئی دوا لینے چلا گیا تو عتیق نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ "یار تم ہی سوچو میری بیٹی ڈاکٹر ہے اور سعید کا بیٹا فقط بی ایس سی ہے۔ فرم کی نوکری ہے دو ڈھائی ہزار تنخواہ آگے کچھ نہیں۔ اس سے کئی گنا زیادہ تو میری لڑکی کمانے لگی ۔۔۔ کوئی تک ہے۔"

ہم عتیق کے گھر پہنچے تو ہمارے سامنے کوک کی بوتلیں رکھی گئیں۔

سعید نے کہا "عتیق میں بھی اس گھر میں پہلی بار آیا ہوں۔" اور تب اس نے باتھ روم کے متعلق دریافت کیا۔

اسی درمیان عتیق مراقبے میں چلا گیا۔ سعید واپس آیا تو اس نے عتیق کو آواز دی اور اس طرح وہ اپنی دنیا سے لوٹ آیا۔

مجھے مسکراتے دیکھ کر دونوں نے بیک زبان کہا "کیوں بھئی کیوں مسکرا رہے ہو؟"

"عتیق میرے یار۔ میں سوچ رہا تھا کہ ....." میں اپنی بوتل کی طرف دیکھنے لگا تو دونوں نے پھر اس بات کا تقاضہ شروع کر دیا کہ میں مسکرانے کی وجہ بتاؤں۔

"تم یہاں ایک خانقاہ کیوں نہیں کھول لیتے۔ ایک روزگار اور سہی۔"

عتیق فوراً بول اٹھا "سخت ملحدانہ خیالات ہیں تمہارے۔"

اس پر مجھے اتنے زور کی ہنسی آئی کہ کوک میرے حلق میں اٹک گئی اور بڑی مشکل سے میں نے اپنی گردن سنبھال سنبھال کر اسے حلق کے نیچے فرو کیا۔

واپسی میں سعید نے مجھ سے پوچھا۔ "عتیق تم سے کچھ کہہ رہا تھا؟"

باہر کے جلووں سے نظر موڑنے کے وقفے میں اچانک میرے ذہن میں صحیح جواب آ گیا۔

"ہاں کہہ رہا تھا سعید نے بہت دیر کر دی عجیب آدمی ہے، اسے پہلے کب جانا چاہئے تھا؟"

سعید کچھ نہیں بولا۔ ٹاکسی روشنی کے سیلاب میں بہتی جا رہی تھی اور کاریں ہر دو جانب شاں شاں گذرتی جا رہی تھیں۔

لیکن سعید کو عتیق کا جواب بے حد اہانت آمیز محسوس ہوا تھا، چنانچہ اس نے کچھ ایسی باتوں کا انکشاف کیا، جو عام حالات میں مجھ سے چھپی رہتیں۔

"عتیق کا حلیہ تم دیکھتے ہو، مجذوب دکھائی دیتا ہے۔ عالم یہ ہے کہ ابھی تک میٹرک بھی نہیں ہوا ہے لیکن بچوں کو اس نے اچھی سے اچھی تعلیم دلائی۔ اس کالونی میں اس کے تین تین مکانات ہیں۔"

اور یہ کہہ کر سعید بڑی معنی خیز ہنسی ہنسا۔ "یہاں سب کچھ چلتا ہے۔"

میں کبھی اس کا منہ دیکھتا اور کبھی اپنے آپ میں گم ہو جاتا۔

میں، عتیق اور سعید مل کر کبھی ایک مثلث بناتے تھے لیکن میں تو اب خیالوں سے پرے ایک نقطہ تھا، یوں مثلث تو کب کا ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے باوجود عتیق اور سعید آج بھی جگری دوست تھے۔

دراصل یہ تصوف کے ایسے ادق مسائل تھے، جو برسوں کی ذہنی ریاضت کے بعد ہی اپنی پوری جزئیات کے ساتھ کسی کی گرفت میں آتے ہیں۔

کئی دنوں کے بعد سعید نے مجھے فون کیا کہ عتیق کے یہاں چلنا ہے، وہ مجھے لینے آئے گا۔

قطار در قطار دودھیا روشنی کی بارات۔۔۔ طوفان بدوش کاریں، ایک عجیب پر سرار ماحول تھا۔ مجھے یہ مناظر بے حد پسند تھے اور میں کافی کافی دیر ان میں کھویا رہتا۔ اس وقت بھی میں ان ہی میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک میرے دل نے مجھے دستک دی۔۔۔ یہ لمحات بڑے قیمتی ہیں۔۔۔ یہاں سے بے جانے کے لئے تمہارے پاس وقت کیا ہوگا۔ بس یہی قیمتی لمحات کہ ان کی بزم آرائیوں سے نہیں مجھے خوش رہنا ہے۔

"سعید"۔۔۔ میں نے سعید کو آواز دی۔

"ہاں کہو —"

"کچھ نہیں یار کچھ نہیں۔"

لیکن سعید خود ہی بول اٹھا۔ "عتیق کی تجویز کے متعلق اس سے کچھ نہ کہنا۔"

میں نے خاصی بے تعلقی سے 'اچھا' کہا اور یوں بیٹھ گیا جیسے مجھے اس بات کا کامل یقین ہو کہ سعید ابھی کچھ اور بھی کہے گا۔ اور میرا یہ شبہ صحیح ثابت ہوا۔

"یہ کالونی جہاں میں رہتا ہوں، یہاں کی سب سے Posh کالونی ہے۔ تمہیں بتاؤ کہ میری بچی ایک نچلے متوسط طبقے کی کالونی میں جا کر خود کو ایڈجسٹ کر سکے گی۔ کوئی میچ نہیں ہے یار۔"

"میرا لڑکا فی الوقت دو ہزار تنخواہ پاتا ہے۔ عتیق کی لڑکی سے اس کی شادی ہو جاتی تو میں چالیس پچاس ہزار روپے لگا کر لڑکی کے لیے ایک کلینک کھلوا دیتا۔"

"یہاں تو ایک جونیئر لیڈی ڈاکٹر بھی پانچ سات ہزار روپے سے اپنا کیریر شروع کرتی ہے۔"

"لیکن عتیق سوچتا ہے کہ اگر اس کی لڑکی کسی ڈاکٹر سے بیاہی گئی تو دونوں مل کر پندرہ ہزار سے اسٹارٹ لیں گے۔" میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

"سخت بھونڈا ہے یہ تمہارا عتیق بھی۔"

جی میں آیا، سعید سے پوچھوں کہ وہ خود کیا ہے؟

لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا کہ مجھے لگتا تھا کہ میرا یہ ریمارک سن کر سعید کے اندر سے ان بستیوں کا نیا آدمی برآمد ہوتا، راستے پیچھے کی ساری روشنیوں کو روندتا ہوا بڑھ کر گاڑی رکواتا اور پھر بڑی بے دردی سے مجھے نیچے اتار دیتا۔

اور یہاں تو حد نظر تک پھیلی ہوئی ایک سڑک تھی جو روشنی کے آبشار میں کھلی نہا رہی تھی —

شش شش گزرتی کاریں، اور ان کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

ایسے میں میں کہاں جاتا؟ — کیونکر جاتا؟ —

۱۹۷۹ء

— ۰ —

رشتہ

میرا دماغ اور میری آنکھیں کام کر رہی ہیں' اور لاتعداد' شاید' میرے سامنے کھڑے ہیں۔
اور یہ جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہے' ایک بھلا سا آدمی ہے۔ بات بات پر مسکراتا ہے۔ کسی بھی معاملے میں الجھنے سے پرہیز کرتا ہے۔ کیسی ہی بحث ہو اسے قدم دو قدم سے آگے بڑھنے سے روک دیتا ہے۔ کوئی دو بات کہے' اس کا مذاق اڑائے تو ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ سب سے جھک کر ملتا ہے۔

ظاہر ہے اتنا کہنے کے بعد آپ یہی فیصلہ کریں گے کہ یہ آدمی خاصا مہذب ہے۔

لیکن ٹھہریئے پوری بات سُن لیجیے۔ اس آدمی کے اندر ایک اور آدمی بھی بستا ہے' جو اس وقت تک سر نہوڑھائے اور خشتا رہتا ہے' جب تک وہ دارو کے دو چار پوّے نہ چڑھا لے۔

دو چار پوّے پینے کے بعد اس کے اندر کا مہذب آدمی' اپنا سب کچھ اس آدمی کے سپرد کر دیتا ہے' جو بے حد حساس ہے اور جو ساری اذیتوں اور ذلتوں کو بے بہ بے اپنے سینے سے دبا تا ہوا انتقامی کارروائیوں پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد وہ مہذب آدمی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر سو رہتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے اندر کا مہذب آدمی محض منافق، بزدل اور مجہول ذہن کا مالک ہے۔ اصل آدمی تو یہ ہے جو حقیقت پسند، راست گو اور دلیر ہے۔

لیکن دوسرا خیال اس سے بالکل ہی مختلف ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ ظالم فرد تو محض دارو کے زور پر زندہ ہوتا ہے۔ یہ تو ایک لادی ہوئی شخصیت ہے، جو مہذب فرد کی دبی ہوئی، کچلی ہوئی شخصیت کو کچھ دیر کے لئے ہاتھی پر چڑھا کر خود غائب ہو جاتی ہے۔ پھر وہ بھلا آدمی، بڑی مشکلوں سے خود کو ہاتھی سے اُتار کر نیچے پڑ رہا ہے پر منہ بسورتا کھڑا ہو جاتا ہے۔

جانے کون سی اس کی اصل شخصیت ہے۔

تو کل کی بات ہے کہ وہ چڑھا کر آیا تو رات ایک پہر گذر چکی تھی، اور میں زمین پر بستر بچھا کر لیٹ چکا تھا۔ اس نے انگارے بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مجھے للکارا۔

"— تم ماضی اور روایت سے لپٹے ہوئے کیڑے — تمہارا اپنا کیا ہے؟ — جب بھی تمہیں کسی شئے کی ضرورت ہوتی ہے، تم اسے ماضی کے جنجال سے نکال لاتے ہو۔"

"— اور ایک میں ہوں۔ میں جس کے آگے صرف حال ہے اور جو اپنی روایت آپ قائم کرتا ہے۔"

میں آپ کو بتاؤں، میں بھی بڑا خبیث ہوں، جب مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ ایک بدمست ہاتھی پر سوار ہے، اور میں زمین پر نہتا کھڑا ہوں، تو پھر مجھے چپ سادھ لینی چاہیئے تھی — دو چار گھنٹے کی تو بات تھی، کیونکہ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ جب وہ سویرے اپنے بہتر نصف کے ساتھ بیدار ہوگا، تو پچھلی رات کے رویے پر تاسف کا اظہار کرے گا، اور میرے ہاتھ پاؤں دبا کر مجھے منائے گا۔

لیکن میری شامت ہی سمجھئے کہ میں نے اس کا یہ جواب دیا کہ جو کچھ وہ بول رہا ہے وہ بھی روایت کا ایک حصہ ہے، اور یہ ساری باتیں محض مکر و فریب ہیں۔

اس پر بات بڑھ گئی۔ میں ایک جملہ بولتا تھا، اور وہ پوری پوری تقریر جھاڑ دیتا تھا۔

میں اس کے اس انداز سے واقف تھا، اور اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بولتے بولتے اور طویل تقریر کرتے کرتے تھک جائے گا، تو پھر وہیں لڑھک کر سو رہے گا۔

پر بات عجیب بات ہوئی۔ اس کا رویہ غیر معمولی طور پر جارحانہ ہوتا گیا اور وہ مجھے ننگی ننگی گالیاں دینے لگا۔

میں نے سخت طیش میں کہا۔ "چپ بے لونڈے، اب کچھ سنا ہے تو گردن توڑ دوں گا۔"

اس پر وہ بالکل ہی بے قابو ہو گیا، اور اس نے بڑی سخت گالی دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھہر تجھے اے بدتمیزی کا مزا چکھاتا ہوں۔"

وہ کونے میں جا کر کچھ تلاش کرنے لگا اور پھر وہاں سے ایک چاقو نکال لایا۔

میں اس کی اس حرکت سے ذرا بھی خائف نہیں ہوا، اور یہ سمجھتا رہا کہ اب وہ چاقو کھول کر دوبارہ تقریر شروع کر دے گا، اس طور پر کہ میرا کہا نہیں مانتا تو اس چاقو کا کہا مان ۔۔۔

میرا سوچنا کسی حد تک صحیح ثابت ہوا کہ وہ چاقو کھول کر پھر تقریر کرنے لگا۔ لیکن ایکدم سے اس نے نعرہ لگایا ۔۔۔ "میں ماضی کو ختم کر دوں گا۔"

اور یہ کہہ کر اس نے بڑی پھرتی سے چاقو میرے سینے میں اتار دیا۔

میں کوئی مزاحمت بھی نہیں کر سکا کہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرے گا، اور وہ خود اوندھے منہ لیٹ کر لمبی لمبی سانس لینے لگا، اور پھر سانس کی آمد و شد نارمل ہونے کے بعد خراٹے ۔۔۔

لیکن یہاں تو کچھ اور ہی ہو گیا۔

چاقو میرے سینے کے اندر پیوست ہوا تو میں صرف "ارے کمبخت" بول سکا، کیونکہ اس کے بعد تو ایسا محسوس ہوا کہ بڑی تیزی کے ساتھ میرے اندر کا سب کچھ باہر نکلتا جا رہا ہے ۔۔۔ بُل بُل کرتا ہوا۔

یوں لگا کہ کسی منہ زور دریا کا بندھ ٹوٹ گیا ہو اور اب سرکش موجیں ہیں اور میں ہوں۔

میں گھٹنوں تک ڈوب گیا ۔ کمر تک ۔۔۔ سینے تک ۔۔۔ گردن تک ۔۔۔ سر تک۔

میں نے اس سیلاب سے نکلنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن میری ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

تب ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سفید گھوڑے پر سفید جاموں میں ملبوس ایک شہ سوار فضا دُں سے اتر کر میرے قریب آیا، اور تیزی سے کسی ایسی شئے کو جو دیکھی نہیں جا سکتی تھی، ایک سفید کپڑے میں لپیٹنے لگا۔

اور وہ شہ سوار کہ فرشتۂ اجل تھا، جب میرا سب کچھ لے کر لوٹنا چاہتا تھا، تو میں نے گڑگڑا کر اس سے درخواست کی کہ وہ میری بصارت اور میرا دماغ اُس وقت تک میرے پاس رہنے دے، جب تک کہ یہ شخص میری لاش کو ٹھکانے نہ لگا دے۔

وہ میری بات مان گیا، اور میرا سب کچھ بجز میرے دماغ اور میری آنکھوں کے لے کر لوٹ گیا۔

میں انجانی منزلوں کی طرف گم ہوتا جا رہا تھا۔

میں وہاں ایک لاش بنا پڑا تھا۔

ایک ثانئے کے بعد میں نے دیکھا کہ اس نے چاقو میرے سینے سے نکال کر پھینک دیا۔

"سو جا سالے لمبی تان کر"

اور یہ کہہ کر وہ خود بھی میرے قریب ہی دراز ہو گیا۔

میں نے غلط کہا، یہ جملہ میں سن نہیں پایا، کیونکہ میری سماعت تو ختم ہو چکی تھی۔ بس اندازہ ہے کہ وہ یہی بولا ہوگا۔

وہ جانے کب تک سوتا رہا۔

میں یک تیزی سے چڑھتے ہوئے ہوکے سیلاب کے درمیان جزیرہ بنا پڑا تھا، بہ ایں عالم کہ فرشتۂ اجل کی عنایت خاص سے ابھی میرا دماغ اور میری بصارت کام کر رہی تھی۔

ایک زمانہ گذر گیا —— میں نے پھر غلط کہا، رات گذر گئی۔ وہ جمائیاں لیتا ہوا اٹھا اور اس نے غالباً مجھے آواز دی۔ ہر صبح وہ مجھے اسی طرح آواز دیا کرتا تھا۔

"میرے باپ تم کہاں ہو؟"

اور تب مجھے اس عالم میں دیکھنے کے بعد وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ وہ سینہ پھاڑ کر رونا چاہتا ہوگا یا شاید رو رہا بھی ہو۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا...

شاید سینہ پھاڑ کر رونا خلافِ مصلحت ہو، یوں کہ اس عالم کے رخصت ہونے کے بعد یقینی عقل اس کی پاسبان ہو گئی ہوگی۔

اس نے جلدی جلدی کہیں سے ایک پھٹی قمیض نکالی، اسے اچھی طرح بھگویا، اور بڑے احتیاط سے میرے اردگرد کے خون کو صاف کیا۔ یہ کرنے کے بعد اس نے میری قمیض اور میرا تہ بند اُتار دیا۔ سارے جسم پر خون کے دھبے تھے، انہیں پونچھا اور جب وہ سینے کا زخم صاف کر رہا تھا تو کہیں سے تازہ خون کے چند قطرے نکل آئے۔

یہ سارے کام کمال مستعدی سے انجام دینے کے بعد اس نے مجھے ایک دھلی ہوئی قمیض اور تہ بند پہنا دیا۔ پھر میری لاش کو اپنے بستر پر ڈال کر، اس نے میرے بستر کو کہ جس پر جا بجا خون کے دھبے تھے، لپیٹ کر ایک کونے میں چھپا دیا۔

تب اُس نے مجھے ایک چادر اوڑھا دی اور چاہا کہ میری آنکھیں بند کر دے لیکن ایسا ممکن نہیں تھا کہ فرشتۂ اجل سے میرا ایک معاہدہ تھا۔

اس نے اپنی جیب کی تلاشی لی تو پچھلی رات کی بچی ہوئی کچھ نقدی برآمد ہوئی، جو یقیناً اس مرحلے کے لیے بے حد ناکافی تھی۔ تب ہی وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

وہ روز کنوئیں میں ڈول ڈالتا اور جو کچھ اس میں آتا، اس سے اپنی دو وقت کی روٹی اور پوّے کا انتظام کر لیتا۔ ان حالات میں اس کی جیب سے چند ایک سکوں کا نکل آنا بھی کمال تھا۔

میرا خیال ہے کہ وہ ایک بار دل کھول کر رونا چاہتا ہوگا۔

اپنی بے بسی پر —

میری موت پر —

لیکن ایسا کرنا غلط ہوتا کہ میں صرف اس کا ساتھی نہیں، اس کا مقتول بھی تھا، اور اسے دنیا کو یہ باور کرانا تھا کہ میں فطری موت مرا ہوں۔

شاید وہ چپکے چپکے آس پاس کے کچھ سیدھے سادے لوگوں کو بلا کر میرا کفن دفن کر دے، زیادہ ہنگامہ اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ وہ یہیں گڈھا کھود کر اس میں میری لاش دفن کر دے ۔

——— لیکن ایک مختصر سے کمرے کی بساط ہی کیا ؟ ـــ

——— پھر پکّے فرش کا سینہ توڑنے کے لئے کدال کہاں سے لائے گا ؟ ـــ

——— فرش کو توڑنے سے جو شور اٹھے گا اُسے کس طرح دبائے گا ؟ ـــ

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ میری لاش کو کسی ٹرنک میں رکھ کر اُسے کسی ٹرین کے ڈبے میں چھوڑ آئے ۔

ـــ لیکن اتنا بڑا ٹرنک کہاں سے لائے گا ؟ ـــ

اس میں کافی خرچ کے امکانات ہیں، اور وہ تو جیسا کہ میں نے ابھی کہا روز مزدوری پانے والا خود ہے ۔

ـــ اُسے پیشگی کون دے گا ؟ ـــ

اور پھر اس طرح شک و شبہے کا ایک دفتر بھی کھُل سکتا ہے ۔ یہ بڑا نازک مقام ہے کہ میں ایک مقتول ہوں، لیکن وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں فطری موت مرا ہوں ۔

تو کیا وہ میرے کفن دفن کے لئے چندہ اکٹھا کرے گا ؟ ـــ

ـــ لیکن وہ تو اسی حالت میں ممکن ہے کہ وہ میری موت کو فطری موت ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے ۔

——— اور اگر وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا اور اس نے پیسے بھی جمع کر لیے، تو کیا وہ شام ڈھلے اُن کی پی نہیں جائے گا ؟ ـــ

——— لیکن گھیسو[*] تو میں ہوں، یہ کام وہ میرے بغیر کیسے کر سکتا ہے ؟ ـــ

یہ اور اسی قسم کے سیکڑوں سوال میرے دماغ میں گشت کر رہے ہیں ۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ سیکڑوں سوال اُس کے آگے بھی سر اُٹھائے کھڑے ہوں گے ۔

۱۹۸۰ء

———+———

[*] گھیسو: پریم چند کے 'کفن' کا ایک کردار

آنے والا

"چونکہ اس قصبے میں یہ مکان سڑک سے قریب تر نظر آیا، اس لئے مجھے یہ خیال آیا کہ رات یہیں گزاری جائے۔"

"اگر آپ ٹھہرنے کی اجازت دے دیں تو ......"

گھر میں دو میاں بیوی، ایک لڑکا اور ایک بوڑھی عورت رہتی تھی۔

مرد نے لپک کر جواب دیا۔ "ہاں ہاں بھائی صاحب، گھر آپ کا ہے، بیشک قیام کرئیے۔"

لیکن اس کی بیوی کی آنکھیں غیر متحرک رہیں۔ اس کے چہرے پر بھی کوئی تاثر نہیں تھا اور نہ ہی اس نے رضامندی کے اظہار میں شوہر کا ساتھ دیا۔ وہ خاموش خاموش سی آنے والے کو دیکھتی رہی، جو گاڑھے کی قمیض اور پاجامے میں ملبوس تھا، اور جس نے اپنے کاندھے پر ایک تھیلا لٹکا رکھا تھا۔

آنے والے نے شکریہ ادا کیا اور ٹھنڈی سانس لے کر بیٹھ گیا۔

اس پر میزبان نے کہا۔ "غسل خانے میں پانی رکھا ہے، آپ منہ ہاتھ دھولیں۔"

تب اس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دوسری بار اس کا شکریہ ادا کیا۔

منھ ہاتھ دھو کر وہ دونوں اسی جگہ آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

'کہاں سے آرہے ہیں؟' ۔۔۔

آنے والے نے کہا۔ "پورب سے آرہا ہوں اور پچھم کی سمت جارہا ہوں"۔

ایسا اکھڑا اکھڑا جواب سن کر جس میں ٹالنے کا انداز نمایاں تھا، مرد کو کسی قدر مایوسی ہوئی، لیکن پھر اس کے دل نے اُسے سمجھایا۔ "ممکن ہے اس نے ٹھیک ہی کہا ہو۔ ایسے جہانیاں جہاں گشت لوگ بھی ہوتے ہیں، جن کا نہ کوئی گھر بار ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی منزل ہوتی ہے"۔

اُسی لمحے اس کی بیوی نے باورچی خانے سے آواز دی۔

وہ گیا تو بیوی نے کہا۔ "آپ بلا سوچ سمجھے جسے چاہتے ہیں ٹھہرا لیتے ہیں"۔

اُس نے سرگوشی کے انداز میں کہا تھا، لیکن شوہر شاید اس سے بھی زیادہ محتاط تھا، چنانچہ اُس نے شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں کے درمیان رکھ کر کہا۔

"آہستہ بولو سن لے گا، تو کیا کہے گا"۔

تب صرف ہونٹوں کو جنبش دیتے ہوئے عورت بولی۔

"کیسی تشویشناک باتیں کرتا ہے، نہ گھر بار ہے نہ کوئی منزل ۔۔۔ پھر یہاں کیا لینے آیا ہے"۔

"لینے آیا ہے"۔ یہ مرد بھی ایک لمحے کے لئے فکر میں ڈوب گیا۔

۔۔۔ گھر میں بیوی کے زیورات ہیں، کچھ نقدی ہے، کپڑے لتے، برتن باسن۔ یہ چیزیں گھر میں ہیں تو ان کی قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا، بازار میں جاؤ تو پتہ چلتا ہے ۔۔۔

لیکن اس نے دوسرے ہی لمحے اس شبہے کو ذہن سے جھٹک دیا۔

۔۔۔ ارے اکیلا آدمی کیا کرے گا، اور پھر یہ تو سیدھا سادھا دکھائی دیتا ہے۔ بیوی تو خواہ مخواہ .... ۔۔۔

اور یہ سوچ کر اس نے بیوی کے شبہے کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

"شبہہ بعد میں کر لینا، پہلے اس کے کھانے پینے کا انتظام کرو"۔

مسافر کے لئے کھانا لگاتے ہوئے اس نے کہا۔

"ہم لوگ سرِ شام ہی کھانے کے عادی ہیں، اسی لئے آپ کو اکیلے ہی کھانا ہوگا۔"

اس نے کہا "کوئی بات نہیں ہے" ـــــ اور اللہ کا نام لے کر کھانے پر بیٹھ گیا۔

دو ایک روٹیاں اس کے پیٹ میں اُتریں تو کھانے میں اس کا انہماک کسی قدر کم ہوا، اور اس نے میزبان کو نظر اٹھا کر دیکھا۔

"آپ کا مکان آرام دہ ہے۔"

اس نے 'جی' کہہ کر گویا اس کا شکریہ ادا کیا۔

اچانک مرد کو کچھ یاد آگیا۔

"معاف کیجئے گا، میں نے اب تک اپنے مہمان کا نام نہیں دریافت کیا۔"

"مسافر ہی کہہ لیجئے، کیونکہ دیکھئے نا آج کی رات میں آپ کا مہمان ہوں، کل کسی اور کا مہمان رہوں گا، پرسوں کسی اور کا، اور نرسوں .... ایسا شخص کسی کا مہمان نہیں ہوتا، اسے تو 'مسافر' ہی کہئے کہ سفر ہی اس کی پہچان ہے۔"

بیوی کے کان کھڑے ہوئے ـــــ نہ نام بتاتا ہے، نہ اتہ پتہ ـــ

مرد کے چہرے پر ایک ساعت کے لئے ایک ناگوار سا تاثر پیدا ہوا، لیکن دوسری ہی ساعت اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا کہ ـــــ

ـــــ ایسے آدمی کی باتوں کا کیا برا ماننا، جو آج یہاں ہے، کل کہیں اور ہوگا، پرسوں کہیں اور ـــــ ہم بہتے ہوئے پانی کی چال دیکھ سکتے ہیں، اس کی گنگناہٹ سن سکتے ہیں، لیکن اس کا نام، اتہ پتہ اور اس کی منزل تو نہیں پوچھ سکتے اور نہ ہی اس سے کوئی معاہدہ کر سکتے ہیں ـــــ تو یہ آدمی بھی تو بہتا پانی ہے۔

کھانے کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

اتنے میں مرد کو یہ احساس ہوا کہ رات زیادہ ہو گئی ہے معاً اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھائی صاحب اب آپ آرام کریں۔"

"بالکل صحیح کہا آپ نے۔ میں بھی تھکا ہوا ہوں، اور آپ کے بھی آرام کا وقت ہو گیا ہے۔"
مسافر کا بستر بچھانے کے بعد، مرد نے ایک صراحی اور گلاس لا کر رکھ دیا، اور تب اُسے 'شب بخیر' کہہ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔
مسافر نے کمرہ اندر سے بند کر لیا تو عورت چپکے سے بولی۔
"اس نے کمرہ اندر سے بند کر لیا ہے، آپ باہر سے بند کر دیں۔"
مرد نے کہا۔ "تم ہوش میں ہو؟ ــ ہو سکتا ہے وہ رات کے کسی لمحے پیشاب کے لئے اٹھے، اور پھر یہ انسانیت سے گری ہوئی بات ہے کہ ہم اپنے مہمان کے ساتھ ایسا سلوک کریں۔"
آٹھ دس سال کا لڑکا جو اُن کے پلنگ سے ملے ہوئے پلنگ پر سو رہا تھا، اچانک سوتے سوتے اٹھا، اور جب اُس نے دیکھا کہ اس کے ماں باپ دھیمے سروں میں کچھ تیز تیز گفتگو کر رہے ہیں، تو اس نے ماں سے پوچھا۔
'کیا ہوا ماں'

ماں نے کہا 'کچھ نہیں تم سو جاؤ'۔
یہ کہہ کر عورت بھی لیٹ رہی لیکن یکدم سے اسے کچھ یاد آ گیا اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔
"پتہ نہیں کون ہے؟ ــ نہ نام، نہ گھر بار، نہ کوئی منزل ــ مجھے تو اٹھائی گیرا لگتا ہے۔ ہر کام بد سوچے سمجھے کرتے ہیں۔ مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا۔"
مرد نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا ــ "کچھ نہیں ہوگا خدا پر بھروسہ رکھو۔ مجھے تو سیدھا سادہ سا آدمی دکھائی دیتا ہے۔
اس پر بیوی نے کہا۔ "ایسے لوگ تو اور بھی خطرناک ہوتے ہیں۔"
مرد پہلو بدل کر لیٹ رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔
لیکن عورت سیدھی لیٹی چھت کو تکتی رہی۔ جب بھی اس پر نیند کا غلبہ طاری ہوتا، وہ اُٹھ بیٹھتی، اور جہاں ذرا سی آہٹ ہوتی تو وہ مرد کے بازو کو اپنی گرفت میں لے لیتی تاکہ اگر واقعی کوئی بات

ہو تو اُسے جگا دے۔

تھوڑی دیر بعد مسافر کے خراٹے سنائی دینے لگے۔

عورت زیر لب بڑبڑائی ۔۔۔ "یہ سب اس لئے کر رہا ہے کہ ہم لوگ بے فکر ہو کر سو رہیں۔ بڑا ہوشیار لگتا ہے۔"

اس کے بار بار بڑبڑانے سے مرد کی آنکھ کھل گئی اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "آخر سوتی کیوں نہیں ہو؟ ۔۔۔ اماں دالان میں لیٹی ہیں، اگر خدا نخواستہ کچھ ہوا تو وہ ہمیں آواز دے دیں گی۔"

عورت نے بگڑ کر کہا۔ "ہونہہ اماں کس کام کی ہیں۔ ہمیشہ پان تمباکو کے نشے میں پڑی رہتی ہیں، وہ سب کچھ صاف کر جائے گا اور انہیں خبر تک نہ ہوگی"۔۔۔ اس کا لہجہ خاصا حقارت آمیز تھا۔

اتنے میں بوڑھی عورت کھانستی ہوئی اُٹھ بیٹھی، اور اس نے تیز تیز لہجے میں ان کی سرگوشیاں سُن لیں۔

اور تب گویا اس نے انھیں اپنے وجود کا احساس دلاتے ہوئے زور سے ہانک لگائی۔

"تم لوگ ابھی سوئے نہیں ہو"۔

عورت نے کہا۔۔۔ "لو ہوگئی چھٹی، اب یہ پورے گھر کو اپنے سر پر اٹھا لیں گی"۔

اس پر مرد، دبے پاؤں بوڑھی عورت کے پاس گیا، اور اس نے اس کے کان کے پاس جا کر کہا "اماں آہستہ بولو، گھر میں مہمان ہیں کیا کہیں گے"۔

"اچھا۔ اچھا" کہہ کر اُس نے پاندان کھول کر ایک پان بنایا، اور تمباکو ڈال کر اپنے منہ میں دبا لیا۔۔۔ اس کے بعد پھر اپنی پلنگڑی پر دراز ہو گئی۔

مرد بھی اپنے پلنگ پر آ کر لیٹ رہا۔

"آخر تمہارا ارادہ کیا ہے" مرد نے دھیرے سے سوال کیا۔

عورت پھر چپکے چپکے بڑبڑانے لگی۔

"آپ کو کیا ہے، آپ اطمینان سے سوتے رہئے۔ یہاں تو ایک پیالہ بھی چوری ہو جائے تو لگتا ہے ایک قیمتی چیز چوری ہو گئی۔ میں نہ ہوتی تو خاک اُڑا کرتی گھر میں۔ آپ تو ہر ایرے غیرے

نقشوں جبرے کو بلا کر ٹھہرا لیتے، جو صبح تک گھر کو جاتی ہوئی رکابی کی طرح صاف کر جاتا۔

مرد نے کہاں "ہاں اسے تو ساری دنیا تسلیم کرتی ہے۔"

عورت بولی "کرتی ہی ہے۔ ایک آپ کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔"

مرد پھر کروٹ لے کر لیٹ رہا۔

عورت اگر دو چار ثانیوں کے لئے لیٹ بھی جاتی تو مسافر کے خراٹوں کے اچانک ٹوٹ جانے سے وہ پھر چونک ہو جاتی، یہاں تک کہ مسافر پھر نئے سرے سے خراٹوں کے راگ الاپنے لگتا۔

آدھی رات کے بعد عورت کو ایسا محسوس ہوا کہ مسافر اپنے کمرے کا دروازہ کھول رہا ہے۔

اس نے شوہر کے بازو کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

باہر نکل کر مسافر نے لوٹے میں پانی لیا اور پاخانے کی طرف چل دیا۔ عورت سہمی سہمی پاخانے کی طرف دیکھتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد وہ آنگن میں کھڑا آسمان کی طرف نظر دوڑا رہا تھا جہاں ستاروں کی محفل گرم تھی۔ اس طرح وقت کا اندازہ لگانے کے بعد وہ پھر اپنے کمرے میں چلا گیا اور اسے اندر سے بند کر لیا۔

عورت نے سوچا کافی چالاک دکھائی دیتا ہے، اسے شاید اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ میں جاگ رہی ہوں۔

وہ پھر دو چار ثانیوں کے بعد خراٹے لینے لگا۔

پھر عورت کو خیال آیا کہ کہیں اس کے تھیلے میں کوئی ہتھیار نہ ہو ـــــ چھرا، چاقو، پستول ـــــ اور یہ سوچ کر رات اسے لمبا سا طاری ہو گیا۔ اگر ایسا ہوا تو ہم لوگ کیا کر لیں گے، یہاں تو گھر میں ایک چھڑی تک بھی نہیں نکلے گی۔

تب ہی اس کے دل میں شوہر کے لئے غصے کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔

ـــــ کیسی بے فکری سے سوئے ہیں، یہ بھی نہیں ہوا کہ کم از کم اس کے تھیلے ہی کی جانچ پڑتال کر لیتے ـــــ مجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں، لیکن خدا نخواستہ میرے بچے کو کچھ ......

اس مقام پر پہنچ کر اس نے شوہر کو ہلکی سی ٹھپکی دی۔

"سنئے! آپ نے اس کا تھیلا دیکھ لیا تھا؟"

مرد جو اپنی بیوی کے بار بار اٹھنے بیٹھنے سے چین کی نیند نہیں سو سکا تھا، جھنجلا کر اٹھا، کچھ دیر تک وہ اپنی ران کھجلاتا رہا، پھر جھلا کر بولا ـــ "کیا بدتمیزی ہے۔ ساری رات تم نے سونے نہیں دیا، اب کیا ہوا؟"

عورت نے وہی سوال دہرایا۔

"ہاں بہت سارے مہلک ہتھیار اس نے اپنے تھیلے میں بھر رکھے تھے۔ چاقو، چھرا، پستول، بم۔"

"ہونہہ دماغ خراب ہے۔"

عورت روہانسی سی ہو گئی اور اس نے چپکے سے کہا۔

"آپ کا کیا بگڑے گا۔"

اس پر مرد نے بگڑ کر کہا ـــ "اچھا اچھا سن لیا، اب نہ اٹھانا" ـــ اور یہ کہہ کر وہ پھر سے سونے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔

عورت نے دل میں سوچا ـــ اچھا ہے پہلے پان تمباکو والی بڑی بی کو معاف کرے گا، ـــ اپنی اماں جائیں گے تو پتہ چلے گا۔

وہ اسی طرح اٹھتی بیٹھتی رہی۔ بار بار اس کے ذہن میں لہریں بیدار ہوتیں۔

ـــ کیا آدمی ہیں کوئی دوسرا ہوتا تو گھر کو بچانے کی فکر کرتا۔ ایک یہ ہیں کہ پتہ نہیں کن لفنگوں کو گھر پر ٹھہرا لیتے ہیں۔ ذرا سوچنے کی بات ہے، نہ گھر کا پتہ بتاتا ہے، نہ منزل کا ورنہ ہی دنیا نام، اور اس پر آکر پڑ رہا ـــ اور اس عالم میں بھی انہیں اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا! حالانکہ معمولی سمجھ بوجھ والا آدمی بھی کہہ دے گا کہ اس میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ آخر یہ گہری رازداری کیوں؟ ـــ

. . . .

ـــ دنیا کا قاعدہ ہے کہ لوگ آتے ہیں، اپنا نام بتاتے ہیں، اتہ پتہ بتاتے ہیں، اپنا کام بتاتے ہیں ـــ تب کہیں جا کر انہیں ٹھہرنے کی اجازت دی جاتی ہے ـــ مگر یہاں

تو بلا سوچے سمجھے ٹھہرا لیا جاتا ہے ــــ پہاڑ جیسا جسم رکھتے ہیں، لیکن عقل چوہے جیسی بھی نہیں گئی ہے۔

مرد دوسری طرف کروٹ لیئے سو رہا تھا۔ لڑکا بھی بے خبر تھا۔ بڑی بی وقفے وقفے پر اٹھ کر ایک نیا پان بناتیں اور تمباکو ڈال کر اسے اپنے منہ میں دبا لیتیں ۔ دوسرے کمرے میں مسافر کے خراٹے لینے کی آواز بلند ہو رہی تھی، ہاں کبھی کبھی خراٹے کی آواز اس طرح بدلے لگتی کہ معلوم ہوتا گاڑی جیسے جیسے دوسری پٹری پر سوار ہو گئی ہے۔

ــــ ہر چیز فکر کرنے کے لئے ایک میں ہی رہ گئی ہوں۔ ایک یہ اماں ہیں کہ سوائے اپنے پان تمباکو کے انہیں کسی چیز کی فکر نہیں۔ ایک یہ ہیں کہ انہوں نے تو شاید قسم کھا رکھی ہے کہ گھر کی بات میں مجھ سے مشورہ نہیں لیں گے، حالانکہ ان کی اس حرکت سے ہمیشہ نقصان پہنچا ہے ۔

. . . .

ــــــ ابھی بڑی کی فکر ہو تو مجھے ہو ــ یہ تو بے فکر آدمی ہیں ۔ ان سے اچھا تو یہ چھوٹا سا لڑکا ہے ۔ اگر یہ جاگتا رہتا تو اس لفنگے سے سب کچھ معلوم کر لیتا بلکہ اس کے تھیلے کی تلاشی بھی لے لیتا۔ ایک یہ ہیں کہ وہ فلسفہ سمجھاتا رہا اور یہ چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے۔

اتنے میں کچن سے کسی برتن کے گرنے کی آواز آئی ۔ عورت سہم گئی اور اس نے باہر کی طرف جھانکا وہاں کچھ بھی نہیں تھا ــ چوہے نے گرایا ہوگا ۔

اسی دوران اس نے ایک نظر میں سب کچھ دیکھ لیا ۔ الماری اور بکسوں میں تالے لگے تھے ۔ ہر طرف سے اطمینان کرنے کے بعد وہ اپنے پلنگ پر آ بیٹھی ۔

اب اسے جماہیاں آنے لگی تھیں ۔ آنکھیں جل رہی تھیں اور سر بھرا بھرا سا محسوس ہو رہا تھا۔

تب ہی مندر سے گھنٹے کی صدا ابھری ۔ عورت نے سوچا ۔ چلو اب سویرا ہو رہا ہے۔

پھر کچھ ہی دیر میں مسجد سے فجر کی اذان ہونے لگی تو عورت نے آنچل سر پر رکھ لیا ۔

ان کی حرکت سے میں رات بھر سو نہیں سکی ۔ کسی کی طرف سے جب تک پورا اطمینان نہ ہو جائے اسے ٹھہرا لینا کتنی خطرناک بات ہے۔ زمانہ ایسا خود غرض ہے کہ کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا لیکن انہیں تو بس ٹھہرا لینے سے کام ہے۔ سوچنا سمجھنا تو ان کی سرشت ہی میں نہیں ہے ۔

اتنے میں مسافر کے کمرے سے چلنے پھرنے کی آواز ابھرنے لگی۔

کمرہ کھول کر وہ باہر نکلا۔ اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور باتھ روم کی طرف چلا گیا۔

عورت اپنے پلنگ پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی، اور وقت تھا کہ اندھیرے اور اجالے کی سرحدوں کے درمیان کا ایک سنسان سفر طے کر رہا تھا۔

مسافر نے ہاتھ منہ دھونے کے بعد آواز بلند کی ——

"بھائی صاحب ——"

اور جب مرد آنکھیں ملتا ہوا اس کے پاس پہنچا تو اس نے کہا۔

"آپ نے رات کا کھانا کھلایا، سونے کی جگہ دی، خدا آپ کا بھلا کرے ——"

"اب میں جا رہا ہوں، آپ اپنا کمرہ دیکھ لیں ——"

مسافر کی آنکھیں صبح کے اجالے کی طرح صاف ستھری تھیں، لیکن عورت کی آنکھیں ——

۱۹۷۹ء

بلب ایک گذرگاہ کا

ایک طرف گلی کوئی چالیس پچاس گز کا سفر طے کرنے کے بعد ایک نسبتاً کشادہ سی گلی میں جا ملتی تھی تو دوسری طرف ساٹھ ستر گز کے فاصلے کے بعد میونسپل کارپوریشن کے لیمپ پوسٹ سے دو چار قدم پرے اس گلی سے کئی ایک گلیاں پھوٹتی تھیں۔

اور جس مقام کا یہ ذکر ہے وہاں رات کو ایسا گہرا اندھیرا چھا جاتا تھا کہ آنے جانے والے کبھی ایک کچے گھر کے آگے بنے جہ بچہ میں گر جاتے، اور کبھی بہت احتیاط سے چلنے کے باوجود اس عقرب نما گڑھے میں پاؤں ڈال دیتے، جس میں نالی کا گندا پانی ہمہ وقت جاری رہتا۔ اس عقرب نما گڑھے کو گلی کے لڑکے جھیل کہا کرتے اور اکثر چھوٹے بچے کھیلتے کھیلتے اس میں کاغذ کی ناؤ چھوڑ دیتے۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ ایک عورت کی چپل اس گندے پانی میں چلی گئی تو اس نے زور زور سے دہائی دی کہ کوئی اللہ کا بندہ اُسے روشنی دکھاتا۔

قریب ترین گھر کا مالک کہ خدا ترس آدمی تھا، اس کی آواز سن کر ٹارچ لے گھر سے باہر نکلا۔

ٹارچ کی روشنی میں عورت نے اپنی چپل برآمد کی، اور پھر اس کے گھر میں جا کر اپنے پاؤں دھوئے، چپل دھوئی اور یوں اسے دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

اس واقعہ کا اس شخص پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے دوسرے ہی دن اپنی دیوار میں چھید کر کے گلی کی سمت بجلی کا تار اور ہولڈر لگایا اور اس میں ایک بلب فٹ کر دیا۔

کچھ دنوں تک وہ بلب —— روشن بلب راتوں میں خیر جاریہ بنا رہا۔ گلی میں آنے جانے والے اوبڑ کھابڑ راستے، نالی، چہ بچہ اور عنقریب نما جھیل کے گدلے پانی سے محفوظ رہے۔ اس طرح گلی کے باسیوں اور دوسرے راہگیروں نے سکھ چین کی سانس لی۔

لیکن ایک دن شام ڈھلے جب اس نے گلی کے بلب کا سوئچ آن کیا تو اُسے یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ گلی میں روشنی کا کوئی کوندا نہیں لپکا۔

وہ تقریباً دوڑتا ہوا گھر سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ ہولڈر کی گردن سے بلب غایب تھا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی معمولی سی چیز کون چُرا لے گیا۔ لیکن دوسری ہی ساعت اسے خیال آیا کہ ممکن ہے بلب ہولڈر میں پوری طرح فٹ نہ ہوا ہو، اور دن کے کسی اوقات میں نیچے گر کر ٹوٹ گیا ہو۔

اس نے نیچے جُھک کے دیکھا لیکن پھر اپنی نادانی پر خود ہی پشیمان ہوا کہ بلب کے بیشتر اجزا کو تو آنے جانے والوں کے قدم کب کے روند چکے ہوں گے۔ ممکن ہے کچھ اجزا نالی میں بہہ گئے ہوں۔ پھر وہ آخر وہاں کیا ڈھونڈھ رہا ہے۔

وہ اس خیال کے آتے ہی اندر گیا۔ وہ بلب جو ایک فاضل بلب کی حیثیت رکھتا تھا، نکال لایا اور اسے اس نے ہولڈر میں فٹ کر دیا۔

کسی راہگیر کے استفسار پر جب اس نے بتایا کہ پہلا بلب غالباً گر کر ٹوٹ چکا ہے، اور اب وہ دوسرا لگا رہا ہے تو راہگیر نے اس پر ایک تعریفی جملہ اُچھال دیا۔

—— بھائی صاحب نیکی کی راہ میں بھی آج کل بڑے جھمیلے ہیں ——

مکان کا مالک آہستہ سے سر ہلا کر اظہارِ تشکر بجا لایا اور یوں گلی میں ایک دوسرے بلب کی

روشنی کا دور شروع ہو گیا۔

چلتے چلتے مالک مکان نے بلب کی ہر دو کیل کو اچھی طرح دیکھ لیا' جو ہولڈر کے خانوں میں پوری طرح پیوست تھیں۔ اتنا کچھ دیکھنے بھالنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ بلب اب گرنے والا نہیں ہے۔

لوگ راتوں میں بلا خوف و خطر گلی میں آنے جانے لگے۔ روشنی چونکہ روشنی تھی' اس لئے وہ اپنا حصار توڑ کر خاصی دور تک چلی جاتی' اور دونوں رخ کا بڑا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیتی۔

آس پاس کے لوگ خوش تھے کہ اس مقام پر بلب لگ جانے سے رات کے وقت گلی کی راہ طے کرنے میں بڑا آرام ہو گیا' ورنہ بلب لگنے سے پہلے آئے دن کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا حادثہ ہوتا ہی رہتا تھا۔

مالک مکان بھی کہ جس نے اپنی دیوار پر بلب آویزاں کیا تھا' بے حد خوش تھا کہ اس کے ایک چھوٹے سے ایثار سے خلق خدا کو آرام ملا اور ایک عرصے سے کوئی واردات سننے میں نہیں آئی۔

اسی دوران بلب ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ بلب والے شخص نے سوچا' اس بار تو بلب کے گرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کیونکہ اس نے اچھی طرح سے بلب کی کیلوں کو چیک کر لیا تھا۔ اس بار تو یقیناً بلب چوری گیا ہے۔

یہ سوچ کر وہ اڑوس پڑوس کے لوگوں کے پاس گیا کہ شاید انہیں بلب کا کچھ علم ہو ـــــ شاید انہوں نے کسی کو چراتے ہوئے دیکھا ہو' لیکن سبھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

ظاہر ہے چور اتنا دیدہ دلیر تو تھا نہیں کہ محلّے والوں کے سامنے سینہ تان کر بلب کی چوری کرتا۔ ـــــ چوری تو اس نے بہ حال رات کے سناٹے ہی میں کی ہوگی۔

تب پڑوسیوں نے اس گلی میں کھڑے کھڑے ایک غیر رسمی سی ملاقات کی اور صورت حال پر غور و خوض کیا۔

دفتر کے ایک بابو کا خیال تھا کہ 'سل' ـــــ وہ پورا نام لینا چاہتے تھے کہ ایک صاحب نے اپنے منھ پر شہادت کی انگلی رکھ کر انہیں روک دیا۔

'بھائی صاحب صرف نام کا پہلا حرف استعمال کیجئے۔ محلّے کے سبھی بچے لفنگے' لونڈے لپاڑی

تو اپنی نظر میں ہیں، پھر کیا ضروری ہے کہ ہم کسی کا نام لے کر اس سے دشمنی مول لیں"۔

کسی نے تجویز پیش کی کہ اس بلب کا نقصان سبھوں کو مل جل کر برداشت کرنا چاہئے۔

لیکن جس شخص نے اپنی دیوار پر بلب لگایا تھا وہ اس تجویز کو گول کر گیا۔ شاید وہ اس خیر کا سارا ثواب اپنے حصے میں لینا چاہتا تھا۔

پھر بھی اس نے دو ایک دن بلب نہیں لگایا۔ پڑوس کے ایک صاحب اپنے یہاں سے بلب لاکر لگانا چاہتے تھے تو اس نے انہیں بھی منع کر دیا۔

"رہنے دیجئے بھائی صاحب، جب لوگ اس کی افادیت کو نہیں سمجھتے تو ہمیں اس دردسری کی کیا ضرورت ہے"۔

اس درمیان گلی میں رات کے اوقات میں دو تین چھوٹی موٹی وارداتیں ہو گئیں۔ ایک صاحب عقرب نما جھیل میں پھسل گئے۔ دوسرے صاحب کسی مکان کے زینے سے ایسے ٹکرائے کہ ان کی ایک پاؤں کی ربر کی چپل کا پٹہ ٹوٹ گیا اور انہیں مجبوراً چپل ہاتھ میں لے کر جانا پڑا۔

ان چھوٹے چھوٹے حادثوں کے بعد مالک مکان نے دیوار پر ایک نیا بلب خرید کر لگا دیا کیونکہ اب اس کے گھر میں کوئی فاضل بلب نہیں تھا۔

بلب کی خریداری کے بعد اس نے گلی والوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی کے سامنے اس بات کا انکشاف کیا کہ اب اس پاور کے بلب کی قیمت ۲½ روپئے ہو گئی ہے۔

تب ہی یہ فیصلہ ہوا کہ بلب پر پہرہ بٹھا دیا جائے۔

دو دو تین تین افراد کا گروہ گلی میں رات کے وقت دو دو گھنٹے کی ڈیوٹیاں دینے لگا۔

لیکن جلد ہی لوگ اوب گئے، اور یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔

"بتاؤ کہ ۲½ روپئے کے بلب کے لئے ساری ساری رات برباد کی جائے۔ لعنت ہے ہم پر"۔

لیکن پھر ایک صاحب فہم نے بتایا کہ معاملہ بلب کی قیمت کا نہیں اس کی افادیت کا ہے۔ وہ ہمیں حادثوں سے بچاتا ہے۔

اور تب ایک آسان صورت بلب کی نگہبانی کی یہ نکالی گئی کہ لوگ گھر بیٹھے دروازوں کے

دیواروں اور کھڑکیوں سے لے دیکھتے رہیں۔

دو چار دنوں بعد جب اڑوس پڑوس کے لوگوں سے یہ دریافت کیا گیا کہ وہ راتوں میں گھر بیٹھے بلب کی نگہبانی کرتے ہیں؟ تو وہ محض 'ہاں ہوں' میں ٹال گئے۔ ادھر بلب والے نے بھی صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ رات کے دو چار گھنٹے دروازے سے لگ کر بیٹھنا کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

وہ سب اپنے اپنے دفتر جانے کو کھڑے تھے' اس لئے یہ بات اس سے آگے نہیں بڑھی اور یہ طے ہو گیا کہ وہ شام کو دوبارہ مل کر اس مسئلے پر گفتگو کریں گے۔

لیکن شام تک بلب چوری ہو چکا تھا۔

تمام شہادتوں سے پتہ چلا کہ یہ چوری دن دھاڑے ہوئی ہے' کیونکہ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ جب سویرے فجر کی نماز پڑھنے جا رہے تھے تو انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ بلب جل رہا تھا۔ دوسرے صاحب نے بتایا کہ انہیں اچھی طرح یاد ہے کہ صبح دفتر جانے سے پہلے جب وہ لوگ رات کی کارگزاریوں پر غور و خوض کے لئے گلی میں یکجا ہوئے تھے تو بلب دیوار پر لٹک رہا تھا۔

عام خیال یہ تھا کہ بلب دوپہر میں چوری ہوا ہو گا ——— گھر والے دفتروں میں رہتے ہیں۔ بچے کھا پی کر سو گئے ہوں گے' اور گلی سنسان ہو گئی ہو گی۔

سبھوں کے چہرے اتر گئے ــ اب اس کا کیا جواب ہے کہ تم اگر رات کو پہرہ دو گے تو ہم دن کو چوری کریں گے۔

'چور کے پاس آپ کی ہر ترکیب کی کاٹ موجود ہے'۔ ایک صاحب نے اظہارِ خیال کیا۔

تب ہی بلب والے نے بڑے دل شکن لہجے میں کہا۔

'بس تو میں اب اس نیک کام سے باز آیا۔'

لیکن شام کو جب ایک پڑوسی نے اپنے گھر سے بلب لا کر لگانا چاہا تو وہ بگڑ گیا ———

"یہ کیا بات ہوئی صاحب' دیوار میری اور بلب آپ کا ــ یہ نہیں ہو سکتا' یہ میری توہین ہے۔"

چنانچہ اس نے نہ خود بلب لگایا ورنہ کسی دوسرے کو لگانے دیا۔

ان رات ایک صاحب جو گلی کے نکڑ پر سے خاصی اچھی واقفیت رکھتے تھے جب نائی' حجام اور

عقرب نما جھیل سے بچ نکلے تو کوڑے کے اس ڈھیر پر چڑھ گئے، جو ادھر تین دنوں سے صفائی کے
محکمے کی ہڑتال کے سبب گلی میں لگ گیا تھا۔ ان کے پیر میں چپل تھی، جس کی وجہ سے کوڑے کے
ڈھیر پر پڑا ایک شیشے کا ٹکڑا ان کی ایڑی کو لہولہان کر گیا۔ ان کے منھ سے زور کی چیخ نکل گئی۔ پڑوس
کے ایک صاحب اپنے گھر سے نکلے اور انھوں نے ان کا زخم دھلا کر مرہم پٹی کر دیا۔ وہ بیچارے لنگڑاتے
ہوئے اپنے گھر کو چل دیے۔

اس طرح پیر پھسلنے اور نالی میں گرنے کے بھی دو چار چھوٹے چھوٹے واقعات رونما ہوئے۔

بلب والے نے ان وارداتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

لیکن تیسرے دن جب ایک کمزور سا راہگیر ایک گھر کے زینے سے ٹکرایا تو اس کا توازن کچھ
ایسا بگڑا کہ وہ خود عقرب نما جھیل میں جا گرا۔ چپل کہیں اور گئی اور عینک کہیں اور ——— وہ آدمی
چونکہ پورے وزن کے ساتھ گرا تھا اس لئے بڑے زور کا دھاکہ ہوا۔ وہ بیچارہ چیخ کر رونے لگا۔

شور سن کر سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ دو ایک کے ہاتھ میں ٹارچ بھی تھی۔ اس
غریب کو جب یہ خبر ملی کہ اس کی عینک کی دونوں تال ٹوٹ چکی ہے تو وہ اپنا غم بھول گیا اور ہائے میری
عینک ہائے میری عینک، کہہ کر چلانے لگا۔

لوگوں نے اسے دلاسا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں دھلائے، اسے پانی پلایا، لیکن چونکہ عام خیال یہ
تھا کہ اسے اب کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہوگا، اس لئے ایک صاحب اسے اس کے گھر تک پہنچا آئے۔

لیکن اس واقعہ کے بعد بلب والے نے سبھوں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ وہ اگلے روز اپنی دیوار
پہ ایک نیا بلب لگا دیگا۔

چنانچہ دوسرے دن دفتر سے آتے ہوئے وہ ایک نیا بلب خرید لایا اور اسے اپنی دیوار پر آویزاں
کر دیا۔ ایکے اس نے گلی والوں کو بتایا کہ اس بلب میں ایک ایسا سسٹم لگا ہے جس سے چور بلب کو توڑ
تو سکتا ہے پر اسے نکال نہیں سکتا۔

امن و آشتی کے دن لوٹ آئے۔

دوسرے دن دفتر جانے سے پہلے کی ملاقات میں ایک پڑوسی نے بتایا کہ رات کسی محلے میں

ایک بدمعاش نے ایک شریف راہگیر کو چاقو دکھا کر اس کی گھڑی اور بٹوہ چھین لیا۔

اچانک ان کے اپنے دلوں میں کہیں سے ایک چور گھس آیا۔

"کیا یہاں بھی ایسا ہو سکتا ہے؟" ——

تب ہی ان میں سے کسی نے کہا —— "لیکن یہاں تو روشنی ہے۔"

نیا بلب کچھ زیادہ ہی دنوں چل گیا، شاید وہ کوچہ لاک سسٹم کی تکنیک سے واقف نہیں تھا۔

لیکن جب وہ اسے کھولنے کی ترکیب جان گیا تو صبح کی سیر سے لوٹتے ہوئے ایک صاحب نے دیکھا کہ بلب اپنی جگہ سے غائب تھا۔ کوئی گھنٹے بھر میں گلی کے ہر شخص کو معلوم ہو گیا کہ لاک سسٹم والا نیا بلب بھی چوری ہو گیا۔

دفتر جانے سے پہلے وہ ملے، تو ان کے دلوں میں آگ سی لگی تھی۔

"بھائی صاحب ڈیڑھ دو روپیے میں تو بیچ دیتا ہوگا۔"

"یہ کام تو کسی بھنگی ہی کا ہے جو اتنے پیسوں میں سینما کا ٹکٹ خرید لیتا ہوگا۔"

"لیکن اب کیا ہوگا" ——

ایک صاحب نے پرانی تجویز دہرائی۔

"بلب کے لئے چندہ اکٹھا کیا جائے۔ صرف بھائی صاحب پر ...." اس نے بلب والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا —— "سارا بار ڈالنا مناسب نہیں۔"

تب بلب والے نے وہی بات کہی جو وہ پہلے بھی کئی بار کہہ چکا تھا۔

"میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ یہ میری ڈیوٹی ہے تو بلب بھی میرا ہی ہوگا۔ لیکن دوستو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اس اندھیرے کے شہزادے کو اجالے میں لائیں جس نے ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے۔"

"بلب کا کیا ہے وہ تو ایک نہ ایک دن آ ہی جائے گا۔"

سنہ ۱۹۸۱ء

———•——

کاروبار

بچے اُسے دیکھتے ہی پہچان گئے تھے کیونکہ گاؤں کی چھت پر انہوں نے کبھی کوئی ایسا
بندر نہیں دیکھا تھا جس کا قد ساڑھے پانچ فیٹ سے کچھ زیادہ ہی ہو اور جو تیزی سے آدمی کی طرح
دونوں پاؤں سے چلتا ہو۔

اس کے علاوہ غور سے دیکھنے پر یہ صاف پتہ چلتا تھا کہ کھال دراصل موٹا جار کیا ہوا کوئی
خاکی کپڑا ہے، جو کثرتِ استعمال سے سیاہی مائل ہو گیا ہے۔

بندر کی دُم بھی غیر معمولی طور پر لانبی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی خاکی نلکی میں کوئی سپرنگ
لگا دی گئی ہے جو حرکت کرنے پر آپ ہی آپ ہلنے لگتی ہے۔

بچے جو سکول سے واپس آرہے تھے، ایک ہجوم کی شکل میں بندر کے پیچھے لگ گئے تھے
انہوں نے اسکول نہ جانے والے بچوں کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ شاید بندر نے بچوں کے اسکول سے
گھر لوٹنے کے وقت کا دانستہ انتخاب کیا تھا، کہ یہ بچے ہی تو تھے جو شور مچا کر راہگیروں اور دوکانداروں

کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے تھے۔

وہ ہر دوکان کے پلیٹ فارم پر چڑھ کر "خوں خوں" کرتا، بندر بھبکیاں دکھاتا، اور پھر دوسری دوکان کا رُخ کرتا۔

لوگوں نے اسے دیکھ کر کہا۔ "اسے تو اس بات کا بھی علم نہیں کہ بندر چوپایہ ہوتا ہے۔"

دوسرے دن بچوں کے ہجوم میں ایک مالن نظر آئی، جس نے گلابی رنگ کی ساری باندھ رکھی تھی۔ یہ ساری جگہ جگہ سے مسکی ہوئی تھی اور کہیں کہیں سے اس کا رنگ بھی اُڑ گیا تھا۔ مالن نے اپنے جوڑے میں گلاب کا پھول، مانگ رکھا تھا، اور اس کی ڈولچی میں کسی جنگلی پھول کے دو چار ہار پڑے تھے۔

"لے لو لے لو منیا کا ہار" ۔ گاتی ہوئی مالن ہر دوکان دوکان جاتی، اور کچھ چلتے ہوئے فقرے بھی چست کرتی ——

"کہاں کہاں پھول سجا رکھے ہیں۔"

"ہار کی قیمت کیا ہے" ۔ سن کر وہ اس کا ترکی بہ ترکی جواب دے کر آگے بڑھ جاتی۔

بچے اپنے خیال میں انکشاف کر رہے تھے "وہی ہے، وہی ہے۔"

شکاری بھی بچوں ہی کے جلو میں نظر آیا۔ یہ کوئی جنگلی شکاری تھا، جس نے چہرے اور جسم پر ضرورت سے زیادہ سیاہی تھوپ رکھی تھی، سر پر ایک رومال باندھ رکھا تھا، اور کانوں میں بالے لٹکائے تھے۔

اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ نچلا ہونٹ اس نے کسی ترکیب سے لٹکا لیا تھا۔ جسم پر صدری اور اس کے نیچے دھوتی باندھ رکھی تھی۔

تیر کمان سنبھالے وہ ہر دوکان پر جاتا، اور متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھتا۔ "آپ نے میرے شکار کو تو نہیں دیکھا، بس اسی طرف بھاگا ہے۔"

تھا تو جنگلی مگر بولی ٹھیٹ اردو کی بولتا تھا۔

گریباں چاک، سر گردوں اٹا، چہرے پر ہوائیاں اُڑتی ہوئی، برہنہ پا، زنجیروں میں جکڑا ہوا، فرطِ غم سے سینا پیٹتا ہوا، وہ ہر دکان پر رک کر پوچھتا "بھائیو میری لیلیٰ کہاں ہے؟" — اور پھر ایک فلک شگاف نعرہ لگاتا "ہائے لیلیٰ!"

اس کے پیچھے بچے گاتے جا رہے تھے "کوئی پتھر سے نہ مارو مرے دیوانے کو"

تب ایک دن لکڑی کی ٹانگیں لگا کر ایک بانس جیسا شخص بازار میں نکل آیا۔ وہ ایک لانبے کرتے میں ملبوس تھا، اور اس کے سر پر سفید جٹا اس طرح رکھی تھی کہ کنارے کنارے اس کے سیاہ بال صاف جھلک رہے تھے۔

اس سے کچھ دنوں پہلے بھی لوگوں نے ایک سگریٹ کمپنی کی اشتہاری مہم میں ایک طویل القامت آدمی کو دیکھا تھا، جو سفید وردی زیب تن کئے تھا اور جس نے ایک خوبصورت سی پی کیپ لگا رکھی تھی۔ وہ شخص ہر موڑ پر رک کر اس سگریٹ کی خوبیاں بیان کرتا تھا۔ مگر یہ شخص تو ہر دکان پر رک کر کہتا "میں ہمالیہ پر رہتا ہوں، ذرا شہر دیکھنے آگیا ہوں"

اس دن ایک شخص ہاتھ میں ننگی تلوار لئے بازار میں نکل آیا۔ وہ وحشیانہ انداز میں زور زور سے چلا رہا تھا — "میں تجھے قتل کر دوں گا، بزدل تو نے میری معشوقہ کو مجھ سے چھین لیا۔" اس کے چہرے پر خشونت تھی اور آنکھوں میں غم و غصے کی لہریں تھیں — میلے کچیلے کپڑوں میں ایک شکستہ حال سا شخص۔

کچھ لوگ کہتے جا رہے تھے۔ "تلوار لکڑی کی ہے"

گیرو سے رنگ کا لانبا کرتا پہنے، گلے میں ایک بڑی سی مالا ڈالے، بڑی بڑی جٹا رکھے اور ہاتھ میں ایک کشکول لئے ایک سادھو ہر دکان پر جاتا اور کہتا۔

"بچہ یہ مایا جال ہے۔ اس سنسار سے ناطہ توڑ، ایشور سے ناطہ جوڑ" اور یہ کہہ کر

آگے بڑھ جاتا۔

بچوں نے جب دیکھا کہ کہیں سے کچھ نہیں ملتا تو، انھوں نے شور مچایا۔ "ہم پہچان گئے، ہم پہچان گئے۔"

ایک ململ کے انگرکھے، تنگ مہری کے پائجامے اور ایک طرف جھکی ہوئی دوپلی ٹوپی سر پر لگائے ایک صاحب اس وضع سے بازار میں نکلے کہ حقہ خدمتگار کے ہاتھ میں تھا اور سٹک پیچ کی نے ان کے ہاتھ میں۔ ایک کش لیتے ہیں اور ہر دوکان پر رک کر کہتے ہیں۔

"آداب عرض کرتا ہوں قبلہ — حقہ حاضر ہے نوش فرمائیے۔"

بچے شور مچا رہے تھے — "اصلی نواب ہے، اصلی نواب۔"

سیاہ سوٹ لگتا تھا کسی کھونٹے سے لٹکا دیا گیا ہے۔ ایک سرخ رنگ کی بڑی ترچھی ٹائی گلے میں ڈالے، سر پر جانے کس زمانے کی ایک اونچی سی فلیٹ ہیٹ لگائے اور منھ میں پائپ دبائے، خاصے گہرے سانولے رنگ کا ایک انگریز سڑک پر دکھائی دیا۔

"آئی ایم .... فرام انگلینڈ۔"

یہاں پہنچ کر اس کی انگریزی دانی کو بریک سا لگ جاتا اور وہ آگے بڑھ جاتا۔

بچے اس کی نقل اتار رہے تھے۔

دہی والی نے سرخ اور سبز چنری باندھ رکھی تھی۔ ایک لانبا سا گھونگھٹ کاڑھے، سر پر مٹکا رکھے، ہر دوکان پر رک کر پوچھتی۔

"دور کی نگریا سے آئی ہوں، دہی بیچتی ہوں۔ لوگے؟"

کسی نے پوچھا — "دودھ نہیں بیچتی ہو؟"

علی بابا ایک گدھے پر سوار تھا۔ اس نے ایک پھٹی پرانی قبا پہن رکھی تھی۔ سر پر ایک بڑی سی پگڑی تھی۔ گدھے کے دونوں طرف بڑی بڑی جھولیاں لٹک رہی تھیں۔

ہر دوکان پر رک کر کہتا ۔۔۔ "کھل جا سم سم ۔"

اس کے پیچھے بچے کہتے جاتے ۔ "بند ہو جا سم سم ۔"

اگلے دن بازار میں ایک مارواڑی سیٹھ نظر آیا۔ اس نے بند گلے کا سفید کوٹ پہن رکھا تھا اور سفید دھوتی کے نیچے چمکتا ہوا سیاہ نیوکٹ جوتا تھا۔ اس نے سر پر زرد رنگ کی مارواڑی وضع کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔

ایک کرانا کی دوکان پر رک کر اس نے کہا۔

"سیٹھ جی میں نے آپ کو پچھلے سال پچاس ہنڈی مال دیا تھا" اس نے اپنا بہی کھاتہ کھول کر دکھایا۔

"اس سال اب تک سو ہنڈیاں دے چکا ہوں ۔"

"کل رقم پچاس ہزار کی بنی ۔۔۔ آپ نے تقاضوں کے بعد بھی ایک پیسہ نہیں دیا۔ زیادہ دیر کریں گے تو قرقی لے آؤں گا ۔"

سیٹھ نے اسے غور سے دیکھ کر ہنس دیا۔

اور تب اس نے کیش بکس سے دو روپے نکال کر کہا۔

"لو یہ رہے تمہارے پچاس ہزار روپے ۔"

اس پر مارواڑی سیٹھ ہاتھ جوڑ کر بولا ۔۔۔

"سیٹھ جی آپ کے اس شہر میں اب تک بارہ کھیل دکھا چکا ہوں۔ مرے بال بچے ہیں۔ اوپر سے گرانی ۔۔۔ آپ ہی لوگوں کا تو سہارا ہے۔ ذرا سوچئے کہ ان دو روپیوں میں میرا کیا بنے گا ۔"

سنہ ۱۹۸۰ء

—— ٭ ——

حالات

یہاں اس ہال میں مختلف علاقوں کے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ شام سے پہلے کچھ لوگوں نے یہاں ایک بڑی دری لا کر بچھا دی تھی، جو گرد سے اٹی ہوئی تھی اور جسے اگر ذرا بھی چھیڑا جاتا تو گرد کا ایسا طوفان اٹھتا کہ سانسیں بحال نہیں رہ پاتیں۔ سو دری بچھانے والوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اسے جھاڑے بغیر بچھا دیا جائے۔ دری جب پورے فرش کو اپنے احاطے میں نہیں لے سکی تو کہیں سے ترپال اور چھوٹی دریاں بھی لا کر بچھا دی گئیں۔

رات آئی تو سڑک کی طرف کی سبھی کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔ موسم گرم ہے، اس لئے سڑک کی جانب کی کھڑکیاں بند کر دینے سے پنکھے گرم گرم ہوا پھینک رہے ہیں۔

میری طرح ہر شخص اس بڑے فرش پر حسب مقدور بستر بچھا کر لیٹا ہے، اس لئے ایسا لگتا ہے کہ ایک بڑے دریا میں بہت سارے بجرے الگ الگ تیر رہے ہیں۔

ہال میں بلب ہیں، مرکری ٹیوب ہیں، لیکن انہیں روشن کرنا خلاف مصلحت ہے، کیونکہ باہر سڑک پر ہیبت کا تسلط ہے۔ ہاں ہال کے باہر ایک بڑی چھت سے متصل دو تین باتھ روم ہیں،

جن میں ہلکے پاور کے بلب جل رہے ہیں، جن کے سبب ہال میں بھی ہلکی ہلکی روشنی آ رہی ہے۔ ایسی روشنی جس میں لوگ خود کو دیکھ سکتے ہیں، اور بہت ہی قریب بیٹھنے والوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو ذرا فاصلے پر بیٹھے ہیں، انہیں ان کے موہوم سے خد و خال ہی نظر آتے ہیں اور بس۔

یہ بھی غنیمت ہے کہ ان ہلکے پاور کے بلب کی روشنی میں آس پاس کے لوگ نظر آ جاتے ہیں، ورنہ مجھ جیسے لوگ جو ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد کبھی باتھ روم جانے کے لئے اٹھتے ہیں اور کبھی پانی پینے کے لئے، بستروں سے گذرتے ہوئے ضرور کسی نہ کسی پر گر پڑتے، کسی نہ کسی کو کچل دیتے اور نتیجے میں چیخ پکار اور ہنگامہ کھڑا ہوتا، جس کے لئے یہ رات اپنے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر سختی سے منع کر رہی ہے۔

دن کے وقت ان اطراف میں نعرے اور آہ و بکا سنائی دی تھی، اور آسمان کی طرف آگ کا بے تابانہ بھاگتا ہوا لشکر دکھائی دیا تھا۔ اب یہ رات خاموش ہے، لیکن جس طرح چیختا ہوا دن بھیانک تھا، اسی طرح خاموشی میں ڈوبی ہوئی یہ رات بھی بھیانک ہے۔

باہر سڑک پر بھاری بھرکم گاڑیاں محوِ خرام ہیں۔ ان کی سست رفتاری سے صورت حال اور بھی ہولناک ہو جاتی ہے۔

ہم یہاں اس ہال میں ہیں کہ جس میں سڑک کی جانب کی ساری کھڑکیاں بند ہیں، لیکن ہم خلاؤں میں گھورتے ہوئے وہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں جو سڑک پر ہو رہا ہے۔ ابھی ایک گاڑی رکی، پھر یکے بعد دیگرے کئی ایک گاڑیاں رکیں۔ گاڑیوں سے خاکی وردیاں سر نکال کر باہر کی طرف دیکھتی ہیں اور پھر بھاری بوٹوں سمیت سڑک پر کود جاتی ہیں۔ ایک ساتھ بہت سے بوٹوں کی دھمک ــــ اسلحوں کا شور ــــ

یہ اسلحے خود شور مچاتے ہیں، لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ دوسرے ہر قسم کے شور کو فنا کے گھاٹ اتارنے کا کام بھی ان ہی سے لیا جاتا ہے ــــ یہ سب بہت پرانا چکر ہے۔

مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم سب اس گھڑی یہاں ہیں مگر دراصل ہم یہاں نہیں ہیں۔ ہم گذرے ہوئے دن کے درمیان کھڑے، آنے والے دن کے متعلق سوچ رہے ہیں۔

کیا ہوا تھا؟ — مختصر سا جواب یہ ہے کہ کچھ ہوا تھا، اور اگر کچھ نہ ہوا ہوتا تو پھر ہم یہاں کیونکر ہوتے؟ —

ہمارے آگے کی ہر شے سیاہی کے نقاب میں لپٹی ہے۔ دیوار کی تصویریں، چھت کی نقاشی، دروازوں کے رنگ و روغن — ویسے ہماری نظروں میں کتنے ہی گذرے ہوئے جہان آباد ہیں۔

مجھے اب باتھ روم جانا ہے۔ بہت سنبھل سنبھل کر باہر آتا ہوں، اور واپسی میں پھر اسی طرح بچتا بچاتا اپنے بستر تک پہنچتا ہوں۔ غور سے دیکھتا ہوں تو بستر سے ایک تکیہ غائب تھا۔ میری بیوی میری عادتوں سے بخوبی واقف ہے، اس لئے اس نے دری میں دو تکیے لپیٹ دیے تھے۔ ایک تکیہ میرے سر کے نیچے رہتا ہے اور دوسرا پہلو میں۔ پہلو میں تکیہ نہ لگاؤں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دل کسی پہاڑی سے لڑھکتا چلا جا رہا ہے۔ یہ تکیہ گویا اس گرتے ہوئے دل کو تھام لیتا ہے۔

پانی میں مٹکے سے پی چکا ہوں۔ چھت پر ایک بڑے سے مٹکے میں پانی رکھا ہے۔ پاس میں المونیم کا مگ ہے اور اس کے برابر ایک چھوٹی سی تپائی پر کچھ پلاسٹک کے گلاس رکھے ہیں۔

اب میرے پاس صرف ایک تکیہ رہ گیا ہے، یوں میں اپنے ایک بازو سے تکیے کا کام لیتا ہوں۔

اس پرانی حویلی میں دوسری طرف عورتوں اور بچوں کے سونے کا انتظام کیا گیا ہے۔ میری بیوی اور بچے وہیں ہیں۔

نیند نہیں آ رہی ہے۔ نہ دماغ بے طرح بھرا ہے، دل پر بڑا بوجھ ہے۔

یہ جو اس زمین پر یہاں سے وہاں تک لوگ اپنے اپنے جزیروں میں آباد ہیں، ان میں میری طرح کچھ اور لوگ بھی ہوں گے جنہیں نیند نہیں آ رہی ہوگی۔ ویسے کہا جاتا ہے کہ نیند تو دار پر بھی آجاتی ہے، اس لئے کچھ لوگ سو بھی چکے ہوں گے۔

جب آبادی میں بھیڑیے نکل آتے ہیں تو لوگ جنگلوں کی طرف بھاگ گئے ہیں۔

نیند نہیں آتی ہے کیا کیا جائے؟ — سر پر چلتے ہوئے پنکھے کو دیکھا جائے —— بیکار —— دیواروں پر لٹکی تصویروں کو دیکھا جائے — عبث — چھت کے نقش و نگار کو دیکھا جائے — فضول —

آخر کیا کیا جائے؟ —

وہ ٹمٹماتے بلب جو کچھ فاصلے پر جل رہے ہیں، وہ تو محض اس لیے ہیں کہ ہم ہال سے باہر نکلتے وقت اور ہال میں داخل ہوتے وقت کسی سے ٹکرا نہ جائیں، کسی کو کچل نہ دیں۔ یوں اس مدھم مدھم سے اُجالے میں پڑھنے پڑھانے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا —

میرے اڑوس پڑوس میں جو لوگ اپنے اپنے بستر پر لیٹے ہیں، اُن کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔ پھر ہمارے دل بھی تو بہت بھرے ہوئے ہیں۔ — جب دل بہت بھرے ہوں تو کوئی بات نہیں کی جاتی، اسی طرح جیسے دل بالکل خالی ہوں تو سوچنا پڑتا ہے کہ آخر کیا بات کی جائے۔

گھڑیال دیر تک منادی دیتا رہا۔

ایک شخص باتھ روم سے نکل رہا ہے، شاید مجھے بھی باتھ روم جانے کی حاجت ہے۔ لیٹے ہوئے لوگوں سے بچتا بچاتا میں ہال سے باہر نکل کر باتھ روم کی طرف جاتا ہوں، وہاں سے واپس آ کر مٹکے کا پانی پیتا ہوں، اور پھر کھلی چھت پر کچھ دیر کھڑے کھڑے آسمان کا رنگ دیکھتا ہوں — وہاں بڑی اداسی تھی۔

ہال میں پہنچ کر اسی طرح سہمے سہمے قدم رکھتا ہوا اپنے بستر پر پہنچتا ہوں تو مجھے یہ خبر ملتی ہے کہ بستر کی چادر اور دوسرا تکیہ بھی غائب ہے۔

یہاں کتنے ہی لوگ ایسے ہوں گے جو تکیے کے بغیر لیٹے، اسی انتظار میں ہوں گے کہ کوئی تکیے والا اُٹھے تو اس کا تکیہ غائب کیا جائے۔ اس نیم تاریک سے کمرے میں کسی چیز کا تلاش کرنا بھی تو ممکن نہیں، پھر اس ہال کا ایک سرا ایسا بھی ہے جہاں یہ مدھم مدھم سی روشنی بھی نہیں پہنچتی، اور اگر غائب شدہ چیزوں کی تلاش کی جائے تو عین ممکن ہے کہ میری بیداری بھی غائب ہو جائے۔

اب میرا ایک بازو میرے سر کے نیچے ہے اور دوسرا پہلو میں — خراٹے جاری ہو چکے ہیں اور جمائیاں آنے لگی ہیں۔ یہاں میری ہی طرح کچھ اور لوگ بھی ہوں گے جو ان کیفیتوں سے دوچار ہو رہے ہوں گے [illegible] ہوں گے کیونکہ نیند کا لطف تو اسی وقت ہے جب دل کو مکمل سکون

ہو اور یہ یقین ہو کہ ہم محفوظ ہیں۔

یہاں تو ہر وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی 'جاگتے رہو۔ جاگتے رہو' کی صدائیں بلند کر رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم جاگ ہی رہے ہیں تو پھر یہ صدائیں کیوں بلند کی جا رہی ہیں۔

یہ لوگ جو اس ہال میں یکجا ہیں، مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ ان میں سے بیشتر کو میں پہچانتا بھی نہیں۔ ہمارا اور ان کا صرف ایک درد کا رشتہ ہے۔ درد ہمارے اور ان کے درمیان ایک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔

کچھ ہوا تھا، کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

یہاں اس ہال میں جو لوگ لیٹے ہیں، وہ یا تو سو رہے ہیں، یا سونے کا سوانگ بھر رہے ہیں۔ مکمل خاموشی ہے، کوئی خراٹے بھی نہیں لیتا۔ اگر کسی طرف سے کوئی آہ بھی بلند ہوتی ہے، تو اس طرح جیسے سیاہ چادر اوڑھ کر نکلی ہو۔ یہاں بے پردہ آہیں نکالنا خطرے سے خالی نہیں کہ راہ میں چور، لٹیرے اور رہزن بھی بستے ہیں۔

دماغ بھرا ہے۔ پپوٹوں پر بڑا بوجھ ہے، وہاں سے وقفے وقفے پر آنسو کے قطرے بھی نکل جاتے ہیں۔

میرا ایک بازو سر کے نیچے ہے، اور دوسرا میرے پہلو میں ہے، میں جاگ رہا ہوں، شاید اس لئے بھی کہ مجھے یہ خدشہ لاحق ہے کہ اگر میری آنکھ لگ گئی تو اس ہال میں جہاں اب تک میری ایک چادر اور دو تکئے غائب ہو چکے ہیں، کہیں کوئی میرا بازو بھی نہ کاٹ لے کہ آخر وہ بھی تو تکئے کا کام دے رہا ہے۔

سنہ ۱۹۸۰ء

اُترتی چڑھتی رونقیں

وہ جو زینے سے اُتر رہا ہے اور وہ جو زینے پر چڑھ رہا ہے —— دونوں کی کسی نہ کسی مقام پر مڈبھیڑ ہو ہی جاتی ہے، اور تب یہ ہوتا ہے کہ علیک سلیک کے بعد ایک اوپر چلا جاتا ہے اور دوسرا نیچے۔

نام جلال الدین احمد خاں تھا لیکن ہمارے یہاں وہ کہلاتا جلّو تھا۔ گھر کے دوسرے نوکروں کی طرح وہ بھی ایک نوکر تھا، پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ دادا میاں کے خاص نوکروں میں سے ہے، یوں کہ دادا میاں کا کوئی کام اس کے بغیر نہیں چلتا تھا۔

دوسرے بھی ان کے کام کر سکتے تھے، لیکن ان کا یہ قاعدہ تھا کہ کوئی سامنے آجائے تو کہتے "بھئی جلّو کو بلاؤ وہ سب کچھ جانتا ہے۔"

اُن کی اس بات کا کوئی بُرا بھی نہیں مانتا تھا، کیونکہ سبھوں کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ جلّو وہ سب کچھ جانتا ہے جو دوسرے نہیں جانتے ہیں۔

اُن کی چیزوں کو رکھنے کا طریقہ — ان کی پسند ناپسند — ان کے معمولات — یہ ساری باتیں ایسی تھیں، جن پر جلو کی پوری پوری گرفت تھی۔

یہ بات تو یہ بھی جانتا تھا کہ ان کے کلاک میں سوموار کو ٹھیک اُس وقت چابی دی جاتی ہے، جب ریڈیو صبح کی خبریں نشر کرتا ہے۔

لیکن پھر یہ کہ صبح وہ کس وقت منہ دھوتے ہیں۔ ان کے لئے گرم پانی کا انتظام کس ماہ سے کس ماہ تک کیا جاتا ہے۔ ان کے ناشتے کی الماری میں کس موسم میں کونسا حلوہ رہتا ہے — وہ صبح کے وقت کتنے پیالے چائے پیتے ہیں۔ چائے میں شکر کتنی دی جاتی ہے۔ کچہری جاتے وقت وہ کونسی چھڑی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے جوتوں میں پالش کتنے کتنے دنوں بعد کی جاتی ہے۔ وہ حجامت کتنے دنوں بعد بنواتے ہیں۔ وہ اپنے دانت کس وقت سے کس وقت تک لگاتے ہیں، اور ان کی صفائی کس کس وقت کی جاتی ہے، اور یہ کہ جس پیالے میں دانتوں کا سیٹ رہتا ہے اس میں پانی کتنی مقدار میں رکھا جاتا ہے۔ سوتے سمے مچھردانی اُتار کر کہاں رکھی جاتی ہے۔ انہیں دن میں کتنے پیکٹ سگریٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دیاسلائی وہ کونسی استعمال کرتے ہیں ——

یہ وہ علوم تھے جن کی جستہ جستہ واقفیت تو گھر کے ہر فرد کو تھی، لیکن ان پہ عارفی جلال احمد عرف جلو ہی کو تھی۔

۲۵

پانچ سال کی میری عمر تھی کہ مدرسے میں میرا داخلہ کرا دیا گیا۔ جلو اس وقت تک جگت پچیس سال کا ہو گا۔ اس کا بڑا لڑکا اقبال محمد خان عرف بلو میری ہی عمر کا تھا۔ وہ بھی کسی مکتب میں پڑھتا تھا۔

بلو اکثر ہمارے یہاں آ جاتا۔ میرے گھر کے ان بچوں کی طرح کی قمیض، پاجامے یا نیکر میں ملبوس جو اس کے ہم عمر تھے۔ پاؤں میں کھڑاؤں، ناک بہتی ہوئی، بال گرد سے اَٹے ہوئے اور ہاتھ پاؤں میں میل —— لیکن ان دنوں بجز اس فرق کے کہ ہم صاف ستھرے رہتے اور وہ گندہ رہتا ہمیں اس کے اور اپنے مابین کوئی اور فرق نظر نہیں آتا تھا۔

بلو ہمارے درمیان کھیلوں کے میل، گلی ڈنڈا، کانچ کی گولیاں اور لٹو لے آتا۔ اور ہم اس کے

ساتھ گھر میں چھپ چھپ کر یہ سارے کھیل کھیلتے۔ دراصل ہمارے گھر میں کھیل کے اوقات مقرر تھے، اور بچوں کو شام کے وقت پارک میں یا کھیل کے میدان میں لے جایا کرتے تھے۔ لیکن ٹھلوؤں کے ان کھیلوں میں ہمیں بڑی دلچسپی کا احساس ہوتا۔ اور بلّو ان کھیلوں میں بڑا ہوشیار تھا۔ پر جب ہم پکڑے جاتے، گھر کی چھت پر یا کہیں کونے کاتر میں تو ہماری پٹائی ہو جاتی، اور ہم سے کہیں زیادہ بلّو پٹتا، کیونکہ گھر والوں کا خیال تھا کہ بلّو ہی ہمیں ان کھیلوں کا شوق دلاتا ہے۔

پھر بلّو کی پٹائی کے بعد ملّال کی بھی اچھی خاصی خبر لی جاتی —— "بیٹے سے کہہ دو کہ گھر میں آتا ہے تو شریفوں کے اطوار سیکھے اور گلی کوچے کے آوارہ چھوکروں کے کھیل بچوں کو نہ سکھایا کرے۔"
اس تنبیہ کے بعد بیچارہ بلّو ایک بار اور اپنے باپ کے ہاتھوں پٹتا، اور خوب گالیاں سنتا۔
اس نوعیت کے حادثوں کے بعد بلّو کچھ دنوں تک ہمارے یہاں آنا جانا چھوڑ دیتا۔ لیکن پھر اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ بڑی سی چھت، اور بڑے سے گھر میں بھاگ دوڑ اور کھیل کا چسکا اُسے کشاں کشاں ہمارے یہاں کھینچ لاتا۔

دادا میاں کی تویل سے اکثر کچھ نہ کچھ رقم غائب ہو جایا کرتی، لیکن وہ جس تہذیب کے آدمی تھے، وہاں طرح دینا اور چشم پوشی کرنا مزاج کا خاصہ بن چکا تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ ان چوریوں کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ ابا جان، میرے دونوں چچا اور گھر کے دوسرے فرد اکثر دبی زبان میں دادا میاں سے کہا کرتے —— "بلّو کو آپ نے بہت سر چڑھا رکھا ہے، یہ سب اُسی کی حرکت ہے۔"
لیکن دادا میاں ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کو دے کر بھول گئے ہوں، یا حساب میں غلطی ہو گئی ہو —— پھر جب تک کسی کو چوری کرتے دیکھا نہ جائے اس پر الزام رکھنا بھی تو مناسب نہیں۔
مگر اس کو کیا کہیں گے کہ جب بلّو ہمیں اسکول پہنچانے جاتا تو اس کی بیڑی کی ڈبیہ میں دو ایک سگریٹ بھی نظر آ جاتے، اور جب وہ ایک خاص شان سے سگریٹ نکال کر پیتا تو اس کے دھوئیں کی بُو ویسی ہی ہوا کرتی جیسی دادا میاں کے سگریٹ کی بُو ہوا کرتی۔

تب گڑبڑ یہ ہوئی کہ ایک رات دادا میاں اپنے بٹوے میں سو سو کے دو نوٹ رکھ کر سو گئے۔ اُن کا بٹوہ ہمیشہ اُن کے سرہانے گدے کے نیچے رہا کرتا تھا۔

دوسرے دن کچہری جانے کے وقت جب دادا میاں نے اپنا بٹوہ کھولا تو اس میں وہ نوٹ نہیں ملے۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا، کیش بکس اچھی طرح کھول کر دیکھا، لیکن وہ نوٹ کہیں نہیں ملے۔ پھر گھر والوں کو خبر ہوئی، اور سب لوگ اپنے اپنے طور پر نوٹوں کی تلاش میں لگ گئے۔ تب ہی میرے چھوٹے چچا نے کہا۔ "ارے نوٹ یہاں کہاں ملیں گے، وہ تو جلّو کے گھر پہنچ چکے ہوں گے" ان کے لہجے میں ترشی اور شکایت تھی۔

دادا میاں اُس وقت بھی اپنی ضد پر قائم رہے۔ "نہیں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے"۔ لیکن یہ معاملہ سنگین تھا کہ ان دونوں سو روپے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ اتنے میں شفیق خاں مختار بھی آ گئے۔ انہوں نے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کی، اِدھر اُدھر نوٹ تلاش کیے، اور آخر میں انہوں نے بھی وہی کہا جو سب کہہ رہے تھے۔ "میں تو سرکار سے بار بار کہتا تھا کہ یہ جلّو بھروسے کا آدمی نہیں ہے"۔

تب ہی کسی نے پوچھا۔ "جلّو ہے کہاں؟" اس کے بعد اس کی کھوج شروع ہوئی۔ وہ پاس ہی ایک چائے خانے میں مل گیا۔ آیا تو دادا میاں نے اسے نوٹوں کے غائب ہونے کی خبر دی۔ جلّو قسم کھانے لگا کہ وہ نوٹ اس نے نہیں نکالے ہیں۔

دادا میاں نے کہا۔ "تم سے یہ کب کہا جا رہا ہے کہ تم نے نوٹ نکالے ہیں۔ میں تو تم سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم نے نوٹ دیکھے ہیں"۔

لیکن جلّو تھا کہ قسم کھائے جا رہا تھا۔ اس کی اس حرکت پر شفیق خاں مختار کو جلال آ گیا، اور انہوں نے کہا۔ "یہ نیچ ذات ایسے نہیں سے گا" یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور انہوں نے جلّو کو دو چار چانٹے کس کس کر لگائے۔

پھر اِدھر اُدھر سے بھی کچھ لات جوتے پڑے، لیکن جلّو تھا کہ "اللہ کی قسم، اللہ کی قسم" کی رٹ لگائے جا رہا تھا۔

اُس دن ہم سبھوں کے سامنے پہلی بار دادا میاں نے گویا ایک راز کا انکشاف کیا۔
"میں تو یہیں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے بٹوے سے ریزگاریاں کس طرح کم ہو جاتی ہیں یا سگریٹ کے پیکٹ سے ہمیشہ دو چار سگریٹ کون غایب کرتا ہے اور حلوے کی قاب سے حلوہ کون نکالتا ہے۔"
یکایک ان کا پارہ چڑھ گیا۔ "کمبخت تو نے میرے احسانوں کا یہ بدلہ چکایا۔ دور ہو جا میری نظروں سے۔"
جلال جانتا تھا کہ دادا میاں کا کہا پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ ایک بار جو فیصلہ صادر کر دیتے تھے، اُس پر کسی بھی حال میں نظرِ ثانی کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔
وہ کچھ دیر کھڑا شفیق خاں کو گھورتا رہا، تب ہی شفیق خاں نے جوتا نکال کر کہا۔ "حرامزادے مارتے جوتوں کے فرش کر دوں گا، بھاگ جا یہاں سے ورنہ پولس میں دے دوں گا۔"
اس طرح جلال سیڑھیوں سے اتر کر چلا گیا، اور وہ روپے جان مال کا صدقہ سمجھ کر بھلا دیے گئے۔

دس سال گذر گئے۔ دادا میاں نے خُلد کا آشیاں آباد کیا، اور اِدھر ہماری دنیا میں وقت چنگیز بن کر اُٹھا، اور اس نے یہاں سے وہاں تک قتل و غارتگری کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس چنگیزی طوفان کے نتیجے میں ایک قالب دو ہو گئے، اور جا بجا دیواریں کھڑی ہو گئیں۔
جب طوفان ذرا سرد ہوا تو ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنے ساتھ بہت سی رونقیں بھی لے گیا۔ تصویریں ماند پڑ گئیں، در و دیوار کی قلعی اتر گئی، اور ہم صورتوں کو دیکھ کر کچھ ایسا گمان ہونے لگا کہ وہ کریم نکلے ہوئے دودھ جیسے ہو گئے ہیں۔
ہر سُو خاک اُڑتی ہوئی، ڈھن ڈھناتی ہوئی حویلیاں اور مکینوں کے سُتے ہوئے چہرے جیسے ساری رات کوئی بھیانک خواب دیکھ کر اُٹھے ہوں۔
وہ شاخ جس پر آشیانہ تھا طوفان کی نذر ہو چکی تھی، اور اب پاؤں تلے تپتی ہوئی زمین تھی اور سر پر غیظ و غضب میں ڈوبا ہوا سورج۔

نوجوان ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں اپنے نام درج کرا رہے تھے، اور ادھیڑ اور بوڑھے اپنی اپنی حویلیوں کو تک رہے تھے کہ انہیں کس طرح آمدنی کا ذریعہ بنایا جائے۔

جلال کے حالات اکثر اس کے سسر سے معلوم ہوتے رہتے۔ ہمارے یہاں سے نکل کر وہ سیدھا کلکتے کو بھاگ کھڑا ہوا۔ پاس میں روپئے تو تھے ہی۔ کچھ بیوی بال بچوں کو دیا، اور کچھ اپنے ساتھ لیتا گیا۔ وہاں ایک موٹر ورکشاپ میں ہلپر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔

پھر معلوم ہوا کہ میکنک ہو گیا۔

اس نے اپنے سالے کے ذریعے اپنے بیٹے جلال کو بھی کلکتہ بلا لیا ہے، اور اسے وہیں پڑھا رہا ہے۔

وہ اپنے مالک کے بہت قریب ہو گیا ہے۔

وہ ہیڈ میکینک ہو گیا ہے۔

اور ایک دن اس کے سسر نے بتایا۔ "آپ نے کچھ سنا، جلال کا مالک مر گیا۔ چار پانچ مہینے ہو گئے۔ لاولد تھا بیچارہ۔"

کچھ دن اور بیتے تو ایک دن سرِ راہ جلال کے سسر سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ "آپ کو کچھ خبر ہے۔ جلال نے اپنے مالک کی بیوہ سے نکاح کر لیا۔ اور تب ہی اس نے اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "پیدائشی حرامی ہے، جس تھالی میں کھاتا ہے، اسی میں چھید کرتا ہے۔ آپ کے دادا نے کیا کچھ نہیں کیا تھا اس کے ساتھ لیکن ....."

تب ایک دن سفید قمیض، لٹھے کے کھڑکھڑاتے پاجامے اور پینٹ کے چرمراتے جوتے میں جلال ہمارے یہاں وارد ہوا۔

وہ دیوان پر بیٹھا رہا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ صوفے پر آ جاؤ، لیکن اس نے بتایا کہ وہ آرام سے بیٹھا ہے۔ اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالا، اسے جلایا اور پھر انگلیوں میں پھنسا کر خوب لمبے کش لینے لگا۔ جانے کہاں سے دادا میاں کے سگرٹوں کی بو میرے شامے میں آ بسی، لیکن فوراً ہی جلال کے سگریٹ کی بو نے اس بو کو پرے دھکیل دیا۔

میں اس کے لئے چائے اور ناشتہ لے آیا۔ وہ کچھ دیر تک حالات کا جائزہ لیتا رہا، اور پھر بہت کچھ جان لینے کے بعد اُس نے پوچھا۔ "بھیا کیا حال ہے؟"

میں نے کہا ـــــ "بس اللہ کا شکر ہے"

اتنے میں ابّا جان آ گئے اور اس نے بڑی پھرتی سے سگریٹ پھینک کر اپنے جوتے سے مسل دیا اور انہیں سلام کر کے مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔

ابا جان نے کہا "بیٹھو بھئی جلال"

اس پر جلال نے کہا "بڑے صاحب آپ کا نمک کھایا ہے"

چنانچہ جب تک ابا جان صوفے پر نہ بیٹھے وہ دیوان پر نہیں بیٹھا۔

میں ہائی اسکول کر کے کالج میں داخل ہو چکا تھا، اور مجھ سے بڑے اونچی تعلیم پانے کے بعد نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

جلال نے بتایا کہ اس کا ورکشاپ خوب چل رہا ہے۔ اُس نے ایک پریس بھی خرید لیا ہے۔ ایک مکان تو اسے اپنی بیوی کا مل گیا ہے۔ اُس کے علاوہ اس نے ایک اور پلاٹ خرید لیا ہے، اور جلد ہی اس میں ہاتھ لگوانے والا ہے۔

جانے لگا تو اس نے ہاتھ جوڑ کر ابا جان سے کہا۔ "کوئی ضرورت ہو تو اس خادم کو ضرور یاد کیجیے گا۔"

ابا جان زیرِ لب مسکرا دئے اور ہم نے محسوس کیا کہ جس طرح جلال کے جملے کی کئی تہیں تھیں، اسی طرح ابا جان کی مسکراہٹ میں بھی کئی تہیں چھپی تھیں۔ اب دادا میاں کی ملنساری اور رواداری ابا جان میں بھی آ گئی تھی، شاید حالات کا یہی تقاضہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے قدرے توقف کے بعد کہا ـــ "ضرور ـــ ضرور"

اس کے بعد جب میں یونیورسٹی کے آخری تعلیمی سال میں تھا تو جلال ایک بار پھر آیا۔ اس دن اسے دیکھ کر ہمیں یہ محسوس ہوا کہ جب وہ پچھلی بار آیا تھا تو گھر کی کچی کھچی رونق بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا، جو اب اس کے گرم کوٹ اور اس کے صاف ستھرے اور اچھی طرح پریس کئے ہوئے

کپڑوں اور اس کی شکل و شباہت سے جھلکی پڑتی تھیں۔

اس بار وہ تھوڑے اصرار پر ہمارے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

ابا جان وغیرہ تو آج بھی اُسے 'تم' ہی سے مخاطب کر رہے تھے، لیکن ہم لوگ اسے 'آپ' کہہ رہے تھے، کیونکہ اب ہم ماضی کے قصّے تیزی سے تہہ کرتے جا رہے تھے۔ اب ان الجابوں کو کھولنے کا ہمیں بہت ہی کم موقع ملتا تھا۔

جلال نے بتایا کہ جلال نے بی۔ اے کر لیا ہے اور اب وہ اسے کسی کام میں لگانا چاہتا ہے۔

وہ گھنٹے دو گھنٹے بیٹھ کر جانے لگا تو اس نے ابا جان سے کہا۔ "بڑے صاحب اگر بھیا کا یہاں کوئی سلسلہ نہ ہو سکے تو آپ انہیں کلکتہ بھیج دیجئے۔"

ابا جان نے آج بھی اسے وہی مختصر سا جواب دیا جو آج سے کئی سال پہلے دے چکے تھے — "ضرور — ضرور"۔۔۔

لیکن جب وہ چلا گیا تو انہوں نے برا سا منھ بنا کر کہا۔

"چھوٹے آدمیوں کے یہی طور طریقے ہوتے ہیں۔ تمہیں بھی اپنے کارخانے میں مستری بنانا چاہتا ہے۔"

تب ایک دن راہ میں جلال کے سسر سے ملاقات ہوئی تو اس نے جلال کے متعلق بتاتے ہوئے کہا — "اس عورت سے اسے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ جلال کی ماں کو ماہ بہ ماہ اتنی رقم بھیج دیتا ہے کہ اس کی مزے میں گذر بسر ہو جاتی ہے۔ جلال کو بھی کسی بزنس میں لگانا چاہتا ہے۔"

پھر کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ کلکتہ کے مضافات میں جلال اور اس کے چھوٹے بھائی نے موٹر پارٹس کی دوکان کھول لی ہے۔

کتنے سال اور بیت گئے۔ میں اپنے دفتری روز و شب میں الجھا ہوا تھا۔ ابا جان اب مستقل گھر ہی پر رہنے لگے تھے کہ اچانک ایک دن جلال پہنچ گیا۔ اتفاق سے وہ اتوار کا

دن تھا اور ہم سبھی لوگ گھر پر موجود تھے۔

اب وہ مزے میں ہمارے ساتھ صوفے پر بیٹھتا اور یوں لگتا کہ وہ ہمارے حالات کا صحیح ادراک حاصل کرنے کے بعد اب ہمارے سامنے کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ البتہ آج بھی جب ابا جان اس کے سامنے آجاتے اور وہ سگریٹ پیتا ہوتا، تو چپکے سے سگریٹ کو ایش ٹرے میں ڈال کر مسل دیتا۔

اُس نے بتایا کہ بڑے لڑکے کے لئے اُس نے یہاں مور پارٹس مارکیٹ میں ایک دوکان لی ہے۔ کل اس کا افتتاح ہے۔ اس خوشی میں آج شام اُس نے اپنے گھر پر محفلِ میلاد کا اہتمام کیا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "دکان کی پگڑی کتنی دی؟"

اُس نے آہستہ سے شہادت کی انگلی اُٹھا دی۔

میں نے کہا۔ "ایک لاکھ؟"

اُس نے آنکھوں کے اشارے سے 'ہاں' کہا۔

وہ جانے لگا تو اس نے ابا جان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "بڑے صاحب چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ پر آپ ہمارے گھر تشریف لائیں تو ہماری عزت بڑھے گی۔" انہوں نے پھر اسی انداز میں کہا۔ "ضرور ــ ضرور"

لیکن شام ہوئی تو ابا جان نے کہا۔ "پیسہ آج کی سب سے بڑی قدر ہے۔ تم لوگ چلے جاؤ میں کہاں جاؤں گا۔"

جلال کا سسرالی مکان کافی بڑا سا دکھائی دیا۔ معلوم ہوا کہ آس پاس کے کئی ایک چھوٹے مکانات خرید کر اس نے اس مکان کی توسیع کرائی ہے۔

مکان مرکری ٹیوب اور ننھے بلبوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔

جلال مجھے کنارے لے گیا۔ "یہ سب سرکار مرحوم کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔" اس نے جلال سے ملایا۔ ہماری اُترن پہننے والا اور پاؤں میں کھڑاؤں گھسیٹنے والا میلا کچیلا جلال آج خوبصورت سا سفری سوٹ زیب تن کئے تھا۔

تب ایک دن میں بس اسٹینڈ پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک نئی جیپ وہاں پر آ گئی۔
جیپ سے بلال نے سر نکال کر کہا۔ "دفتر جا رہے ہیں تو آ جائیے میں بھی اُدھر ہی جا رہا ہوں۔"
میں نے کہا۔ "نہیں آپ جائیے میں چلا جاؤں گا۔"
لیکن اس کے بے حد اصرار پر بالآخر مجھے جیپ میں بیٹھنا ہی پڑا۔
وہ اپنے کسی کاروباری دوست سے باتیں کر رہا تھا اور میں اس کے پورٹ فولیو میں گم تھا جس پر 'سید بلال احمد' کا لیبل چسپاں تھا۔
اچانک اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "گپتا جی ان سے ملئے 'یہ ہیں میرے دوست یوسف صاحب، ان سے ہمارے خاندانی مراسم ہیں۔ ان کے والد بھی میرے والد کے دوست ہیں۔"
میں نے فی الفور ماضی کے سارے اوراق کو جلا کر خاک کر دیا' اور گپتا جی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں ان کے والد میرے والد کے گہرے دوستوں میں ہیں"۔

سنہ ۱۹۸۱ء

---

۲۳ گھنٹے کا شہر

وہاں کوئی مکان باہر سے مقفل نہیں ہوا کرتا، سبھی اندر سے مقفل ہوا کرتے۔ گھروں کے اندر دروازوں کی کنڈیاں چڑھی رہا کرتیں، اور ان کی چٹخنیاں لگی رہا کرتیں، بلکہ بیشتر گھروں میں تو دستور تھا کہ لوگ دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کرنے کے بعد اینٹ اور پتھر رکھ کر انہیں اور بھی مضبوط کر دیا کرتے۔

لیکن یہ سب دل بہلاوے کے سامان تھے، یوں کہ ان حفاظتی تدبیروں سے کچھ بھی تو بنتا نہیں تھا۔ شہر میں ایسے ایسے ہولناک واقعات ہوتے کہ لگتا کہ بجلی کا زبردست شاک لگا ہے، اور حواس یکلخت عاروں شانے چت ہو گئے ہیں۔

مثلاً یہ دیکھئے کہ الف نے چند در چند حادثوں کے بعد اللہ اللہ کر کے صبح کی، گھر کے سبھی دروازے اور کھڑکیاں اندر سے مضبوطی سے بند کیں کہ اتنے میں زور دشور کے ساتھ ایک دروازہ آپ ہی آپ کھلا، اور کئی ایک دراز قد بگولے اپنی اپنی الگ ہستیاں لئے گھر میں گھس آئے۔

تماشے دیکھنے کے لئے وہ اپنے محور پر چکر کاٹتے رہے۔ دفعتاً یہ دیکھنے میں آیا کہ چند ایک سوکھے سوکھے اجسام صرف چڈیاں باندھے سر کے بل گھر میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کی آنکھیں پیٹھ پر تھیں، کسی کی پیٹ پر، اور کسی کی ٹخنے پر۔ اتنے میں گھر کے ڈیڑھ سالہ بچے کی ٹانگ کراس کی شکل میں پیٹھ سے جا چپکتی ہے، اور وہ گول مٹول سی چیز بن کر ہوا میں معلق سا ہو جاتا ہے۔ تب ہی ان اجسام میں سے کوئی اسے اپنی ٹانگوں میں لے لیتا ہے، اور وہ اسے اس طرح اچھالتا ہے کہ وہ دوسروں کی ٹانگوں میں جا گرتا ہے۔ یوں وہ دیر تک اسے اپنی ٹانگوں میں اچھالتے رہتے ہیں۔ پھر وہ کسی طرح زمین پر آ رہتا ہے۔ بچے کے زمین پر آ جانے کے بعد وہ اسے ٹیبل ٹینس کا بال اور اپنی ہتھیلیوں کو ریکٹ بنا کر اس سے گیم شروع کر دیتے ہیں۔

بالآخر ایک زوردار سٹروک پر بچہ اپنے بستر پر جا گرتا ہے۔ اس کی ٹانگیں آزاد ہو جاتی ہیں، اور وہ خود بے ہوش ہو جاتا ہے۔

اچانک وہ سر کے بل کھڑے انسانی پیکر مٹیالے رنگ کے دھوئیں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، اور آن کی آن میں وہ دھوئیں کی شبیہیں بڑے خوفناک لکڑ بگھوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ دروازہ جو ان کے آنے کے بعد بند ہو گیا تھا، آپ ہی آپ کھل جاتا ہے، اور وہ لکڑ بگھے بھیانک چیخیں بلند کرتے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں۔ اور دروازہ دوبارہ بند ہو جاتا ہے۔

تب کا یہ گھر بھی ایک گم داستان سناتا۔

ایک گھر کے بزرگ نے بتایا کہ دن کے وقت ان کا جی چاہا کہ ذرا پڑوسی کے یہاں سے ہو آئیں۔ بہت سارے منع کرنے کے باوجود انہوں نے بڑی ہمت کی تھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے کی چھت پر بہت سے نسوانی اجسام پیٹ کے بل کچھ اس طرح دکھائی دیے کہ ان کی ٹانگیں دونوں جانب ایک دائرہ بناتی ہوئی ان کے کاندھوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھ ان کی پشت پر بندھے تھے۔ ان کی آنکھیں اپنے کوٹروں سے نکل کر ان کے پیٹ کا طواف کر رہی تھیں، اور ان کے منہ سے کنکریوں جیسے بلبلے نکل رہے تھے، جو باہر آتے ہی تیزی سے اپنا حجم بڑھانا شروع کر دیتے، حتیٰ کہ زمین پر گرتے

تو جاری پتھروں کی شکل اختیار کر لیتے ۔

بزرگ کے گھر سے نکلتے ہی ایک سل جیسا پتھر ان کے سامنے آگرا۔ پتھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سلوں کا ڈھیر ہو گیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے دروازے کے اندر چلے گئے۔ ان کے اندر جاتے ہی سلوں کی بارش بند ہو گئی، اور تب وہ ساری پتھر کی سلیں برف کی سلوں میں تبدیل ہو گئیں اور تیزی سے پگھلنے لگیں۔ اس کے بعد انہوں نے عجیب تماشہ دیکھا کہ وہاں سینے بھر پانی کا ایک دریا تھا جو پانی کی دیواروں کے اندر قید تھا، اس میں کسی قسم کا تحرک نہیں تھا۔ بزرگ نے اندر سے دروازہ مقفل کر کے اسے اچھی طرح بند کر لیا، اور اپنی چارپائی پر آگرے۔ اتنے میں ان کی چارپائی اوپر اٹھ کر چھت اور فرش کے درمیان معلق ہو گئی ۔

سارے دن کوچہ و بازار میں ویرانیاں گشت کرتیں، خاک کے تودے مست خرامیاں کرتے رہتے۔ در بدر روحیں سارے میں گشت کرتی رہتیں۔ کسی نے ذرا کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی در [illegible] میں سے ایک پتھر آتا اور اس کی ناک لہولہان کر جاتا۔

[illegible] گھنٹے کا شہر تھا، کیونکہ ۲۴ گھنٹے گزرنے کے بعد گھنٹے بھر کے لئے ان بدروحوں کی [illegible] گھنٹے بھر کے عرصے میں کیا کوئی ڈیڑھ سو میل کا سفر طے کر سکتا تھا؟ — [illegible] طے کرنے کے بعد ہی [illegible] آبادیاں [illegible] انسانی آبادی کا فاصلہ کہیں بھی ڈیڑھ سو میل سے کم کا نہیں تھا۔

شہر میں بسیں اور دوسری سواریاں بھی چلتی تھیں، لیکن کوئی بھی سواری ہو، وہ گھنٹے بھر میں [illegible] ڈیڑھ سو میل کا سفر کس طرح طے کر سکتی ہے۔

بس ایک چھوٹا سا مسئلہ کو [illegible] تھا جو ان کی رسد، ان کے بازاروں کے ضروری سامان اور ان کی ڈاک باہر سے نہ آ پاتا، اور جب [illegible] آسیب زدہ شہر کی ڈاک اور دوسری مصنوعات جنہیں لوگ بند مکانوں میں بیٹھے [illegible] کے تیار کرتے تھے [illegible] جایا کرتا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ایک شخص کسی طرح بائیسٹ کو ملا کر شہر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس خاندان کے ان افراد پر جو شہر میں رہ گئے تھے مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

جوں ہی ۲۴ واں گھنٹہ ختم ہوا، گھر کے سبھی افراد مکان میں بند ہو گئے۔ دفعتاً بند کھڑکیوں اور درازوں سے شعلوں کے قافلے اندر آنے لگے۔ یہ شعلیں ایک لمبی قطار میں اندر داخل ہوئیں اور انہوں نے اندر آتے ہی کمروں کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ وہ اپنا دائرہ کبھی چھوٹا کر لیتیں اور کبھی بڑا کر لیتیں۔ پھر کچھ شعلیں چھتوں پر الٹی لٹک گئیں۔

سبھی کمروں کا یہی حال تھا۔ وہ اپنی چارپائیوں پر بیٹھے تو انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان پر کھڑی کھڑی کیلیں بچھا دی گئی ہیں۔

تب وہ اپنے عبادت خانے میں جا بیٹھے ——— شہر کے ہر گھر میں ایک کمرہ عبادت خانے کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا، جہاں لوگ اپنے اپنے طور پر عبادتیں کرتے اور ان بلاؤں سے نجات حاصل کرنے کی دعائیں مانگتے۔

چونکہ یہ بدروحیں عبادت خانوں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتی تھیں، اس لئے شہر میں یہ رسم چل گئی تھی کہ جب لوگ ان بدروحوں کے ہاتھوں بے حد تنگ آجاتے تو اپنے اپنے گھر کے عبادت خانے میں پناہ لیا کرتے۔

ساری رات وہ عبادت خانے میں بیٹھے رہے اور ساری رات جھنگ کے کفن میں ملبوس بدروحیں کہ جن کے سر پر آنکھوں میں جلتی چتائیں سا لگائے، ان کے آگے چل رہے تھے، گردن اور آمد [illegible] میں اپنی بدبختی کا نغمہ [illegible] ——— ایسی بھیانک آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ یوں [illegible] سبھی [illegible] ایک ساتھ [illegible] رہے ہیں۔

[illegible] وہ بے حد پریشان رہے [illegible] جلتی شعلیں ان کے کمروں کا طواف [illegible] اپنے عبادت خانے [illegible] ہو جاتے تو [illegible] بدروحیں اپنے کئے [illegible] ساری رات [illegible] بیٹھیں [illegible]۔

پھر [illegible] ہر ایک کو [illegible] پھرتے۔ اور جب وہ [illegible] عبادت خانے میں [illegible] میں کھڑے ایسی دلخراش آوازیں سنائی دیتیں [illegible] مختلف ہوتیں۔

بہت کئی دنوں کی عبادت اور کئی دنوں کی دعاؤں کے بعد حالات کسی قدر نارمل ہوئے اور وہ پھر اپنے اپنے گھروں میں آ بسے۔

اسی طرح ایک شخص ڈاک کے تھیلے میں گھس کر اس شہر سے جاگ لپلاتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ۲۴ واں گھنٹہ ختم ہونے پر جب اس کے گھر والے، گھر واپس آ کر دروازے اور کھڑکیوں میں قفل لگا چکے تو اچانک بڑے زور کی آندھی آئی اور جو جہاں تھا وہاں سے اُڑتا ہوا فضا میں گشت لگانے لگا۔ ان میں سے کچھ لوگ چارپائی پر بیٹھے تھے، کچھ کرسیوں پر تھے۔ اور کچھ کھڑے تھے۔

ساری رات وہ اسی طرح فضا میں چکر کاٹتے رہے۔ فضا میں آگ کے بھیانک شعلے انہیں چاٹ جانے کو اپنی لپلپاتی زبان بڑھاتے، لیکن چونکہ وہ اللہ آمین کر رہے تھے، اس لئے وہ پھر لوٹ جاتے۔ صبح ہوئی تو وہ آندھیوں کے دوش پر اپنے مکان میں واپس آ گئے، لیکن یہ ایک عالم کہ جو جس پوزیشن میں تھا، اسی پوزیشن میں دیوار میں چپکا رہا۔ اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، اور نیچے فرش پر کئی ایک بڑے اژدر دُم کے بل کھڑے ناچ رہے تھے، اور اپنے منھ سے آگ پھینک رہے تھے۔

دو چار دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا، پھر جیسے جیسے دنوں نے اس حادثے کو بھلا دیا، اور حالات اعتدال پر آ گئے۔

لیکن یہ کہنا کہ حالات اعتدال پر آ گئے تھے اپنی جگہ خود ایک مضحکہ خیز سی بات ہے، کیونکہ ۲۴ واں گھنٹہ ختم ہونے پر انہیں اخبار ملتا تو اس میں بڑی لرزہ خیز خبریں ہوتیں۔

اس اخبار کی اشاعت کا یہ دستور تھا کہ ہر گھر کا ایک ذمہ دار فرد اپنے گھر کے عبادت خانے میں بیٹھ کر گھر کی خاص خاص وارداتوں کو ایک بڑے کاغذ میں قلم بند کر لیتا، اور اسے وہیں عبادت خانے میں چھوڑ دیتا۔ یہ آپ بیتیاں عبادت خانے میں اس لئے لکھی جاتی تھیں کہ انہوں نے جب بھی انہیں اپنے رہائشی کمروں میں لکھنا چاہا تو یہ ہوا کہ کبھی کاغذ میں آگ لگ گئی، کبھی قلم نے اپنے منھ سے اس طرح روشنائی اگلنی شروع کی کہ سارا کاغذ دیکھتے ہی دیکھتے رنگین ہو گیا اور کبھی یہ ہوا کہ کاغذ کی پرزیاں بن کر ہوا میں اُڑ گئیں۔

۲۴ گھنٹے گذرنے کے بعد سبھی گھروں کی خبریں ایک خبر رساں ایجنسی کے حوالے کر دی جاتیں، جنھیں ایڈٹ کر کے وہ دوسرے دن اخبار میں شامل کر لیتے۔

۲۳ گھنٹوں میں وہ عام گھڑیوں سے کام لیتے، جن میں گھنٹے اور منٹ کا حساب ہوتا، لیکن جونہی ۲۳ واں گھنٹہ ختم ہوتا، وہ اپنی اپنی کلائیوں پر ایک خاص قسم کی گھڑی باندھ لیتے۔ جن میں صرف سکنڈوں کا حساب ہوتا، کیونکہ اس شہر کا ہر فرد یہ جانتا تھا کہ یہاں ۲۲ گھنٹے خبیثوں کی حکومت ہوتی ہے اور ۲۴ واں گھنٹہ ان کا اپنا ہوتا ہے۔

ایک گھنٹے میں ۶۰ منٹ ہوتے ہیں، اور ہر منٹ میں ۶۰ سکنڈ ــــ اسی طرح گھنٹے میں ۳۶۰۰ سکنڈ ہوتے ہیں ــــ تو یہ خاص گھڑی سکنڈوں کی گھڑی تھی۔

اور ان ۳۶۰۰ سکنڈوں میں، بلا کی تیز رفتاری کے ساتھ وہ سارے کام انجام دیتے ــــ بازار، دفتر، بینک، خریداریاں، ملنا ملانا، شادی بیاہ، عبادت، تعزیت ــــ سب کچھ اسی گھنٹے میں ہوتا۔

یہ وقت جو اُن کے لئے خاصا قیمتی ہوتا، اس کا پورا لیکھا جوکھا ان کے پاس ہوتا ــــ ۳۶۰۰ سکنڈوں کا ــــ

دفتر ــــــ ۱۲۰۰ سکنڈ

بازار اور

دوسرے ضروری کام ــ ۱۲۰۰ سکنڈ

ملنا ملانا ــــــ ۶۰۰ سکنڈ

واپسی ــــــ ۶۰۰ سکنڈ

۳۶۰۰ سکنڈ

زندگی سے اس مبس میں ٹھنڈی ہوا کا یہ ایک گھنٹہ دلوں میں تازگی لاتا، آنکھوں میں روشنی اور امید کا شہر آباد کر جاتا، اور انہیں زندگی کی معنویت سے روشناس ہونے کا ایک موقع بہم پہنچاتا۔

اخبار یا شہر نامہ وہ اپنے عبادت خانے میں پڑھا کرتے۔ اگر وہ انہیں اپنے گھر کے رہائشی حصے میں پڑھنے کی کوشش کرتے تو ان کی یہ کوشش رائگاں جاتی۔

اس سلسلے میں مختلف واقعات رونما ہو چکے تھے۔

مثلاً ایک صاحب اپنی چارپائی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ اچانک روشن دان سے ایک سفید کبوتر پھڑپھڑاتا ہوا کمرے میں چلا آیا (روشن دان اچھی طرح بند تھا) اور ٹھیک ان کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھا۔ ان کی محویت ذرا کم ہوئی اور کبوتر کی غٹرغوں رک گئی تو انہوں نے منہ کے سامنے سے اخبار ہٹایا، جہاں کبوتر بیٹھا تھا، وہاں ایک زرد رُو چرخ جیسی بلا، چوڑی باندھے ننگ دھڑنگ نظر آئی۔ انہوں نے دل ہی دل میں کچھ پڑھا۔ تب ہی اس بلا نے ان کے ہاتھ کا اخبار نوچنا شروع کر دیا۔ وہ پورا پورا ورق نوچ کر منہ کی طرف لے جاتی۔ منہ سے آگ کا شعلہ نکلتا اور چشم زدن میں اس ورق کو جلا کر خاک کر دیتا۔ اس طرح چند ہی ساعتوں میں وہ اخبار راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ اس کے بعد اس بلا کو روشندان نے اسی طرح اپنی طرف کھینچ لیا، جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔ پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کدھر کو غائب ہو گئی۔

دوسرے ایک صاحب کا قصہ ہے کہ وہ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں بند دروازہ زور سے کھلا، اور ایک بڑی خوفناک صورت کا بندر کہ جس کی دُم میں آگ لگ رہی تھی دروازے سے نمودار ہوا اور اس نے جھپٹا مار کر اخبار ان کے ہاتھ سے چھین لیا، اور اسے اپنی دُم کی آگ میں جھونک دیا۔ پھر جدھر سے آیا تھا، ادھر ہی سے رپس ہو گیا۔

چنانچہ ان واقعات کے بعد لوگ اخبار بھی عبادت خانوں میں پڑھنے لگے۔ اخبار میں انہیں ان کے شہر کے اتنے احوال مل جاتے کہ دوسرے شہروں کا احوال پڑھنے کی انہیں خواہش بھی نہیں ہوتی۔

ایک نوجوان خواب میں گلستاں کی سیر کر رہا تھا کہ یکایک اسے یہ محسوس ہوا کہ اس کے پلنگ کے برابر روشنی کا زبردست جھماکا ہوا، پھر روشنی کسی خوش گلو چشمے کی طرح گنگنانے لگی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ایک سراپا قیامت اس کے پلنگ کے پاس کھڑی کچھ اشارے کر رہی ہے۔

نوجوان اپنے گھر والوں سے، دوسرے لوگوں سے اور اخبار کے ذریعے آتنک وادی خبریں سن چکا تھا اور پڑھ چکا تھا کہ اسے فوراً یہ خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ بھی کوئی خطرناک چال ہے۔ وہ دل ہی دل میں اس سے نجات کی دعائیں مانگنے لگا۔

سرو قامت دوشیزہ نے کہ جس کا شباب اس کے پیرہن سے پھوٹا پڑتا تھا، آہستہ سے اپنے زیریں جامے کا ایک کونا اوپر اٹھایا۔ نوجوان نے دیکھا کہ وہاں بے پناہ بہاریں جلوہ گر تھیں، لیکن وہ جانتا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے کوئی بھی غلط قدم اٹھایا اور خاک میں ملا۔

پھر چشم زدن میں اس کے سامنے حیات کا سرچشمہ تھا — نور میں دھلا جسم — تب وہ ریشمی جامے دھواں بن کر اڑ گئے اور اب نوجوان کے سامنے سب کچھ تھا ——— بلندیاں، نشیب پر آسائش تدبیریں کر رہی تھیں۔ پستیاں جو بلندیوں کی طرف جانے کی راہ تلاش کر رہی تھیں — ایسا سانچے میں ڈھلا جسم نوجوان نے اس سے پہلے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ ہوشیار تھا اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ کسی طرح اسے نجات ملے۔ جب سبھی ترغیبات ناکام ہو گئیں تو نوجوان کو یوں لگا جیسے کہیں سے گندے نالے کی بو آ رہی ہے، جیسے ایسا محسوس ہو کہ لاتعداد سڑی گلی لاشوں کی بدبو اس کے مشام کو ڈس رہی ہیں۔

اچانک وہ ڈھلا ڈھلایا جسم کٹ کٹ کر گرنے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سامنے ایک مکروہ صورت ضعیفہ کھڑی تھی جس کا سارا جسم جھریوں سے پٹا پڑا تھا۔ آنکھیں ہزاروں فرسنگ اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں، اور سر پر چھدرے چھدرے سفید بال اُگے تھے۔

تب ہی کمرے میں ایک دردناک چیخ گونجی، اور کمرے کی دیوار شق ہوئی اور ایک کم خمیدہ ضعیفہ اس میں سما گئی۔

ہر گھر اپنی کہانی اخبار کو سونپ دیتا۔ اس طرح ہر گھر ایک لاتعداد کہانیوں والی کتاب بن گیا تھا۔ لیکن ۲۴ گھنٹے گزرنے پر جو ایک گھنٹہ یا ۶۰ منٹ یا ۳۶۰۰ سکنڈ انہیں ملتے، ان میں وہ کوشش کرتے کہ زندگی کے سارے کام انجام پا جائیں ——— کفن دفن، شادی بیاہ، سبھی کچھ ———

ایک گھر کا قصہ ہے کہ جب دولہا دولہن حجلۂ عروسی میں ملے تو سیر کرتے کرتے دونوں ایک دوسرے کے جنستان کی طرف نکل گئے۔ ابھی انہوں نے دو چار ہی جھلک اس کی دیکھی ہو گی کہ انہیں یوں لگا کہ تخت پر کفن اوڑھے ایک لاش پڑی ہے، چونکہ اس شہر کی لغت سے 'حیرت انگیز' لفظ نکال دیا جا چکا تھا، اس لیے انہوں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اچانک اس لاش کے سینے سے خون کا فوارہ سا جاری ہو گیا۔

وہ لوگ یقیناً کچھ بدحظ ہوئے ہوں گے، پھر بھی وہ سیر کر کے ہی لوٹے۔

'حیات کا انجام موت ہے' ۔۔۔ لیکن اس درس کا یہ کوئی محل نہیں تھا کہ یہ رات تو بقول شاعر بہت راتوں کے بعد آئی تھی۔

وقتاً فوقتاً مختلف گھروں میں لوگوں کے مرنے کی بھی خبریں ملتیں، لیکن ایک دو ڈھائی سال کے بچے کی موت بڑی حسرت ناک ہوئی۔ وہ باتھ روم میں سیٹ پر بیٹھا تھا، باتھ روم کا دروازہ کھلا تھا کہ اچانک اس کے سامنے چھت سے ایک کا خون بھرا جانور ٹپکا۔ بچہ جو چھپکلی کے گرنے پر چیخ پڑتا تھا، اس منظر کی کہاں تاب لا سکتا تھا۔ وہیں چیختے چیختے ڈھیر ہو گیا۔ گھر کے لوگ بھاگتے ہوئے آئے تو ایک کالی بلی اُن کی ٹانگوں سے نکل کر بھاگ گئی۔ لڑکے کو کچھ دیر بعد ہوش آیا، لیکن وہ پھر کانپنے لگا۔ لوگوں نے بدن چھوا تو اسے بڑا تیز بخار تھا۔

بچے کو عبادت خانے میں لے گئے۔ کئی دنوں تک اس پر سرسامی کی کیفیت طاری رہی، اور اسی عالم میں وہ بچہ ختم ہو گیا۔

وہاں مُردے کی تدفین بھی ایک زبردست مسئلہ تھی۔ ابتدا میں لوگ مردے کو مروجہ طریقے سے دفن کر دیتے یا جلا دیتے، لیکن اس طرح ہر بار یہ تھا کہ بلائیں انہیں ان کے قبروں اور ان کے مرگھٹ سے اُڑا لے جاتیں اور تب وہ لاشیں بھی اسی عزل بیابانی کا ایک حصہ ہو جاتیں۔ چنانچہ لوگوں نے کافی غور و خوض کے بعد یہ کیا کہ قبروں کے چاروں طرف ایک حصار بنا دیتے، اور پھر چاروں کونے پر

لکڑی کا ستون کھڑا کر کے ان پر آیات کریمہ لٹکا دیتے اور لوح مزار پر بھی آیات کریمہ کندہ کرا دیتے۔
مرگھٹوں میں بھی تقریباً یہی رواج تھا، جہاں مُردہ جلایا جاتا، وہاں چار کونے میں چار کھمبے نصب کر کے ان پر مقدس اشلوک لٹکا دیتے۔

اور یہ سارے کام ۲۴ دن گھنٹے میں کیے جاتے۔ قبرستانوں میں گورکن ہمیشہ قبریں تیار رکھتے۔ کیوڑے کی بوتلیں، کفن اور اگر بتیاں بھی وہیں مل جاتیں۔ اسی طرح مرگھٹ پر بھی لکڑی، گھی اور چندن وغیرہ کا انتظام رہا کرتا۔

قبرستانوں میں گورکن اور مجاور، اور مرگھٹوں میں پنڈت اور آگ دینے والے ہر وقت ۲۴ دن گھنٹے، دفتر کے اوقات کی طرح پابندی سے پہنچ جایا کرتے۔

ہر گھر کفن کے علاوہ اپنی بساط کے مطابق کافور، چائے کی پتی اور نیم کی پتی کا ڈھیر رکھا کرتا، اور اگر رات کو کوئی ایسا ویسا حادثہ پیش آ جاتا، تو لاش کو عبادت خانے میں نہلا دھلا کر، کفن دے کر اس پر ڈھیر ساری چائے کی پتی ڈال دی جاتی، مزید احتیاط کے طور پر اسے کافور میں بسا دیتے، اور اس کے سرہانے لوبان اور دیگر اقسام کی خوشبوئیں جلا دیتے۔

جب عبادت خانوں میں مردے رکھنے کا رواج نہیں ہوا تھا، تو گھر کے افراد کے درمیان سے لاش اُٹھ جاتی تھی اور وہ منہ بے بس و مجبور تماشائی بنے دیکھتے رہ جاتے تھے۔

ایک صاحب رات کے وقت اپنی چارپائی پر سوئے تھے ان کے گھر میں چھت کے اوپر روشن دان تھا، اور ان کی چارپائی ٹھیک روشن دان کے نیچے بچھی تھی۔ نیند میں انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے دو مشٹنڈے سانڈ آپس میں لڑ رہے ہیں، بڑی عجیب سی آواز تھی۔ ان کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ روشن دان سے تار جیسی دو کالی کالی ٹانگیں جھول رہی ہیں کہ جن کے سل جیسے تلووں سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ اچانک تلووں سے ساز کی آواز آنے لگی، اور تب گانے بجانے والا کا پُتلا سا چھت اور فرش کے درمیان ایک بُت سے تالیوں پر نغمہ سرائی میں مشغول نظر آیا۔
دوسرے افراد جو اس کمرے میں سوئے تھے، وہ بھی اس بے وقت کی راگنی کے چھڑ جانے سے جاگ اُٹھے۔

ناگاہ کہیں سے ایک تلوار نمودار ہوئی اور وہ سازندوں اور گانے والوں کی گردنیں اڑا کر غائب ہو گئی۔ تب انہوں نے دیکھا کہ وہ کٹی ہوئی گردنیں اور وہ بے گردن کے دھڑ ان لموؤں میں جذب ہو گئے۔ اور آبنوسی ٹانگیں دھواں بن کر اسی روشن دان سے واپس ہو گئیں۔

گھروں میں اکثر ایسا ہوتا کہ لوگ کھانے کی میز پر ۔ ناگہاں یہ دیکھتے کہ ایک ذمہ ۔۔ پر لاتعداد چھپکلیاں چکر کاٹنے لگتیں۔ عورتیں چیخنے لگتیں اور مرد بھی بدمزہ ہو جاتے۔ آخر ان میں سے کوئی زیرک بول اٹھتا۔

"انہیں ہمارا مقدر سمجھو اور صبر و شکر کر کے کھاؤ۔"

لیکن وہ کھانا سبھوں کی طبیعت سے اتر جاتا۔ اور کوئی بھی دوبارہ میز پر بیٹھنے کا روادار نہ ہوتا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ قورمے کے ڈونگے میں مری چھچھوندر دکھائی دے جاتی اور سارا قورمہ نالی میں پھینک دیا جاتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کھانے سے انسانی فضلے کی بو آنے لگتی۔

ان سب واقعات کے بعد لوگوں نے عبادت خانے میں کھانے کا رواج شروع کر دیا۔

وہ کھانے کے کمرے کو ترک کر چکے تو باورچی خانے میں آسیبی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ گوشت کی بوٹیوں میں کیڑے بجبجانے لگتے۔ سبزیوں میں سڑاند پیدا ہو جاتی اور کبھی یوں ہوتا کہ پوری پوری دیگچی اڑ کر پائخانے کی سیٹ میں جا گرتی۔ آخر انگیٹھیاں بھی عبادت خانے کے ایک کونے میں پناہ گزین ہو گئیں۔

ایسے موقعوں پر وہ سوچتے کہ اگر ان کے گھروں میں عبادت خانے نہ ہوتے تو پھر کیا ہوتا؟

لیکن یہ ۲۲ گھنٹوں کا احوال تھا۔ ۲۲ گھنٹے گزرنے پر وہ پورے ۔۔۳۶ سکنڈ کے لئے آزاد ہوتے۔

یہ ۲۲ گھنٹے کا تپتا ہوا صحرا! جہاں ہر وقت سر پر آگ برساتا ہوا سورج ہو۔ اور قدموں تلے جلتی ہوئی زمین ہوتی ۔۔ جہاں پیاس کے مارے حلق میں کانٹے ہی کانٹے اگ آتے۔

اور زبان سوکھ کر مسموم ہواؤں سے نمی کی خیرات مانگنے بے دست وپائی کے عالم میں تن تنہا باہر نکل آتی ــــــ وہاں یہ ایک گھنٹے کا نخلستان بڑا ہی فرحت بخش ثابت ہوتا۔

اسی دوران شہر میں ایک بڑا ہی دردناک واقعہ پیش آیا۔ ۲۴ ویں گھنٹے میں ایک شخص پائیلٹ کی نظر بچا کر چپکے سے جیلی کوپٹر میں جا بیٹھا۔ کسی راہ گیر نے اسے دیکھ لیا اور پائیلٹ کو خبر کردی۔ پائیلٹ نے اسے باہر نکال دیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے جانے سے اس کا پورا خاندان ظلم و ستم کا نشانہ بنے گا۔

تب ۲۴ واں گھنٹہ ختم ہوتے ہی ہوا کا ایک زوردار جھونکا اسے اس کے گھر سے اُڑا لے گیا۔ فضا میں پہنچ کر اس کا سارا جسم زنجیروں میں جکڑ گیا اور وہ خود سر کے بل آسمان میں چکر کاٹنے لگا۔ اچانک کہیں سے ایک کوڑا نمودار ہوا اور اس پر شپاشپ برسنے لگا۔

جب وہ شخص بے ہوش ہو گیا تو کسی نے ملکے سے اس کے منہ پر پانی کا چھینٹا دیا اور اس کے منہ میں پانی کی دو چار بوند ٹپکا دی۔ اسے کسی قدر ہوش آیا تو دوبارہ کوڑے برسنے لگے۔

۲۳ گھنٹے ختم ہوئے تو وہ شخص آپ ہی آپ اپنے گھر میں آگرا۔ اس کا سارا جسم زخموں سے پھٹ چکا تھا۔ وہ بخار سے جھن رہا تھا اور اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔

اُسے گھر کے عبادت خانے میں لایا گیا۔ اس کے جسم پر لیپ چڑھایا گیا، اور اسے کچھ دوا وغیرہ دی گئی۔

۲۴ واں گھنٹہ گذرتے ہی عبادت خانے کے چاروں طرف لوہے کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ کچھ لوگ اندر رہ گئے اور کچھ لوگ باہر۔

باہر والے سہمے سہمے بنی چارپائیوں پر آ بیٹھے۔ تب ہی انہوں نے دیکھا کہ روشن دان سے دو سیاہ ٹہنیوں جیسی ٹانگیں نکلیں اور بڑھتے بڑھتے فرش پر آ ٹکیں۔ دھوبی کے پاٹ جیسے پاؤں رکھنے والی یہ بلا روشن دان سے باہر گھر کے سامنے والے نیم کے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر اپنا سر رکھے۔ بے تعلقی سے دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی ناک اور منہ سے گندے بلبلے نکل رہے تھے،

اور درخت روشنی کے سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔

یہ بلا جب چاہتی اور جسے چاہتی ٹانگ مار کر پلنگ سے الٹ دیتی۔

۲۲واں گھنٹہ ختم ہوا تو وہ لوگ بے ہوشی کے عالم میں عبادت خانے سے باہر نکالے گئے۔ سزا یافتہ تو سخت اذیتیں جھیل کر دو تین دن کے اندر ہی مر گیا، لیکن وہ لوگ کئی دنوں تک مختلف قسم کی جان لیوا پریشانیوں میں مبتلا رہے۔

اس واقعہ کا شہر کے اخبار میں زبردست ردعمل ہوا ــــ

اخبار نے لکھا تھا ــــــــ بس ثابت ہوا کہ اکیلی سوچ سے مسائل اور بھی بڑھتے ہیں، اس لئے جب بھی سوچو تو سارے شہر کے لئے سوچو اور یہ بات ذہن میں رکھ کر سوچو کہ ــــــــ

ــــــــ وقت صرف ایک گھنٹہ ہے،

اور فاصلہ ڈیڑھ سو میل، ــــــــ

سنہ ۱۹۹۱ء

ــــــــ ◆ ــــــــ

محبس

اس نے کسی کل کو دبایا تو گنبد میں ایک راستہ بن گیا، جو اپنے ساتھ روشنی کی ایک چوڑی پٹی بھی لیتا گیا۔

اس شخص نے کچھ کھجوریں اس کی جھولی میں بھر دیں، اور پھر پانی بھر کر چھاگل دیتے ہوئے اس سے یوں گویا ہوا کہ وہ ایک ذہین اور طباش آدمی ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ دو چار گھڑی میں یا زیادہ سے زیادہ دو چار دن میں اس کل کا سراغ لگا ہی لے گا، جو اس تہ خانے میں پوشیدہ ہے، اور جسے دباتے ہی یہ کھڑکی کھل جائے گی، تب ہی وہ ساری قیمتی اشیاء جو اس میں بند ہیں اس کی ہو جائیں گی ــــ دولت و ثروت اس کے گھر کی باندی ہوگی۔

یہ کہہ کر اس نے اس سے اور بھی معذرت کی، اس کے حق میں دعائے خیر کی اور 'خدا حافظ' کہہ کر اسے اس راستے پر ڈال دیا جو تہ خانے میں جاتا تھا۔

اس کے نیچے اترتے ہی اوپر والے شخص نے کل کو دبایا، جس سے تہ خانہ بند ہو گیا، اور وہ راستہ بھی کہیں غائب ہو گیا۔

تہہ خانے میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک قطار میں کئی الماریاں سونے کی سلوں، سونے اور چاندی کے ظروف اور ہیرے جواہرات کی بھری تھیں، اور اس کی مخالف سمت کی قطار میں کئی الماریاں کتابوں کی تھیں۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ بیش بہا اشیا نہ ہوتیں تو پھر وہ یہاں آتا ہی کیوں؟

چنانچہ سب سے پہلے اس نے ان جلوؤں سے اپنی آنکھوں کو روشن کیا۔ اس کے دل نے خوشی کے شادیانے بجائے، اور اس کے ہونٹوں پر ٹھنڈے پانی کا چشمہ رواں ہو گیا۔

اُس نے اس سرے سے اس سرے تک پھیلی ہوئی الماریوں کا جائزہ لیا۔

الماریاں مقفل تھیں، اور قفل زنگ آلود ہو چکے تھے۔ اُس نے سوچا "خیر دیکھا جائے گا۔"

وہ والہانہ انداز میں الماریوں کا معائنہ کرتا رہا، اور دل ہی دل میں ان کی مالیت کا اندازہ لگاتا رہا۔

اب وہ ایک بے حد متمول شخص ہو جائے گا۔ اتنا امیر و کبیر اتنا مالدار کہ ......،

اس "کہ" کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے ۔۔۔ لیکن چند ہی ساعتوں میں اس نے بہت سے منصوبے تیار کر لئے اور اپنے ذہن میں خوابوں کی ایک جگمگاتی دنیا آباد کر لی۔

کئی بار ان زر و جواہر سے بھری الماریوں کو دیکھنے کے بعد جب اسے اس بات کا اطمینان کامل ہو گیا کہ اب وہ چیزیں اس کی ہیں، وہی ان کا واحد مالک ہے، تو اس نے مقابل کی قطار میں کتابوں کی الماریوں کا جائزہ لیا ۔۔۔ بے شمار کتابیں ۔۔۔ وہ یہ سوچ کر خوش ہوا کہ اس علم کے خزانے کا بھی وہی اکیلا حقدار ہے۔

"جب دولت کی فراوانی ہو تو علم حاصل کرنے میں بھی لطف آتا ہے۔"

ادھر بھی اس نے ایک ایک الماری کا جائزہ لیا ۔۔۔ اُس نے سوچا کتابیں بھی یقیناً نادر ہوں گی ۔۔۔ اس نے کبھی خواب میں بھی اتنی دولت کا تصور نہیں کیا ہو گا، اور نہ کبھی یہ سوچا ہو گا کہ علم کا ایسا بیش بہا خزانہ اس کے ہاتھ لگے گا۔

وہ شخص جو اسے یہاں لایا تھا، اس کا کتنا بڑا محسن تھا کہ اس نے اتنا بڑا خزانہ بھی اس کے سپرد کر دیا، اور اسے فروغ دینے کے لئے علم کی دولت بھی سونپ دی ۔۔۔ تب ہی اسے اپنے محسن

کہ وہ بات یاد آئی کہ تہہ خانے کے اندر بھی کل ہے جس کے دبانے سے تہہ خانہ کھل جاتا ہے ــــ

دو چار گھڑی یا زیادہ سے زیادہ دو چار دن۔

دو چار دن بھی ہوئے تو کوئی بات نہیں ــــ آخر دنیا کا اتنا بڑا خزانہ یونہی تو نہیں ہاتھ آجائے گا ــــ بس یہیں کوئی کل ہوگا۔

گنبد نما چھت پر مکڑیوں کے جالے تنے تھے۔ چھت پر اس جالے کے شامیانے کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ کئی جگہ جالوں کی بڑی بڑی لٹیں آویزاں تھیں ــــ چھت نہ ہوئی برگد کا کہنہ درخت ہوگی۔

کافی دیر تک چھت کو تکتے رہنے کے بعد اس کی نگاہیں فرش پر اُتر آئیں، اور تب اس نے پہلی بار دیکھا کہ فرش پر جابجا کئی ایک انسانی پنجر پڑے ہیں۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"یا خدا جب میں ان زر و جواہرات اور کتابوں کی الماریوں کی سیر کر رہا تھا، اس وقت یہ ڈھانچے کہاں تھے؟ ــــ کیا شوق کی شدت میں یا انتہائی خوشی کے لمحات میں انسان بالکل سامنے کی شے کو بھی فراموش کر دیتا ہے؟ ــــ یا یہ ڈھانچے ابھی ابھی آئے ہیں؟"

تب اس نے یہ محسوس کیا کہ وہ پنجر جیسے سرگوشیوں میں اس سے کہہ رہے ہیں۔

"ہم بھی کبھی اس بیش قیمت خزانے کے تنہا مالک تھے"

اسی دوران اس پر ایک آہنی رجائیت کا غلبہ ہوا اور وہ آپ ہی آپ بول اٹھا۔

"[illegible] تھے [illegible] پیچھے سے مر گئے ورنہ اس ایک تہہ خانے میں اس کل کا سراغ لگانا کون سی بڑی بات ہے ــــ"

[illegible] کہا۔

"آخر تمہارا [illegible] کس طرح ملتا ــــ اس کے مقدر میں تو [illegible] موت تھی ــــ"

اس نے [illegible] ــــ [illegible] ایک بات ہوئی چلتے چلتے اس کل کا پتہ بھی بتا دو ــــ [illegible] ہم [illegible] تھے۔

پھر اب اس کل کو تلاش کرنے کی ذمہ داری صرف اس کی تھی۔ فرش پر ہر کونے کا [illegible]

اس نے بغور جائزہ لیا کہ شاید وہاں کوئی کل دبا ہو' لیکن فرش پر جا بجا ان پنجروں کے علاوہ جن کے گوشت و پوست سڑ گل کر ختم ہو چکے تھے' اب کچھ نہ تھا۔

اس نے فرش پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ہر جگہ اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری کہ شاید کہیں کچھ گمن گرج ہو' شاید فرش ہی پر کوئی کل چھپا دیا گیا ہو۔ لیکن ایک ٹھوس سی آواز کے سوا اسے کچھ سنائی نہ دیا۔

فرش کے بعد اس نے جالے بھری دیوار کو تھپتھپایا ـــ چند غیر معمولی جثے کے کمڑے تیزی سے اوپر کی سمت بھاگنے لگے' چیونٹیوں کا لشکر بکھر گیا' اور اس کی ہتھیلیوں پر گرد کی تہہ جم گئی ـــ وہ گھوم گھوم کر دیوار کو ٹھوک بجا رہا تھا۔ ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر اس نے دیوار کے اوپری حصے کو بھی آزمایا' لیکن کہیں بھی کوئی کل برآمد نہ ہوا۔

عرش و فرش اور دیواروں پر اسے کچھ نہ ملا تو اس نے الماریوں کا بغور جائزہ لیا' اور تب اُسے یہ معلوم ہوا کہ الماریوں اور دیواروں کے درمیان اتنی جگہ چھوڑ دی گئی تھی کہ ایک آدمی قدرے دقت سے ان میں سما سکتا تھا۔

یہ دیکھ کر اسے ایک طمانیت بخش احساس ہوا ـــ "یقیناً اب اس کل کا سراغ مل جائے گا' سوچو کمبخت نے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

پہلے وہ جواہرات کی الماریوں کی پشت پر اپنی بغل کی جانب سے داخل ہوا۔ یوں کہ اس کے پاؤں آگے جانے کی بجائے اس کی داہنی سمت جا رہے تھے' دفعتاً وہ ایک پنجر سے ٹکرا گیا۔ اس کے منھ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے پنجر کو کھینچ کر باہر نکالا' اور فرش پر ڈھیر کر دیا اور جب اُسے نکال چکا تو اس نے دیکھا کہ قریب ہی ایک اور پنجر بھی کھڑا تھا۔

یہاں بھی ہر طرف جالے اور ان کی لمبی لمبی لٹیں تھیں ـــ ان کے علاوہ مکڑے' چیونٹیاں اور دوسرے کیڑے مکوڑے ـــ ادھر فرش پر نیز در و دیوار پر مٹی اور گرد کی تہیں' باہر کے فرش اور دیوار پر جمی ہوئی مٹی کی تہوں سے زیادہ موٹی تھیں۔ لہٰذا اسے بے حد گھٹن کا احساس ہوا۔

لیکن اسے کل کی تلاش تھی' جسے دباتے ہی یہ تہہ خانہ کھل جائے گا اور وہ باہر نکل جائے گا۔

مع ساز و سامان (اس نے چپکے سے اپنے دل میں کہا)۔

کل وہ تلاش کرے رہے گا، خواہ اس کے لئے اسے پاتال ہی میں کیوں نہ جانا پڑے۔

پاتال کہاں ہے؟ —

اس پکے فرش تلے؟ — جانے کتنی گہرائیوں میں ہوگا؟ —

پر اسے جو کچھ کرنا ہے، بہت جلد کرنا ہے۔ آخر یہ کھجوریں کب تک ساتھ دیں گی، اور یہ

چھاگل کا پانی —

وہ الماری اور اس سے ملی ہوئی دیوار کو دیر تک ٹٹولتا رہا، دیر تک تھپتھپاتا رہا۔ نیچے

سے شروع کرکے اوپر تک پہنچا، پھر اوپر سے ٹٹولتا ہوا، تھپتھپاتا ہوا پائے تک پہنچا —

یہاں تک کہ ابتدا اور انتہا کا فرق مٹ گیا۔ پھر بھی کچھ نہ ملا۔ اس کے اندر غصے کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

"کہتا تھا کہ خلاء میں تمہیں اسی طرح کا ایک کل ملے گا۔ کتنا وقت ہو گیا ابھی تک....."

اور جب وہ جواہرات کی الماریوں کی پشت سے برآمد ہوا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ گرد

میں لپٹا ہوا بھوت بن چکا ہے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر سر، منہ اور ہاتھوں کی اچھی

طرح صفائی کی۔

"ابھی تو تلاش کی پہلی منزل ہے اور ابھی سے یہ حال ہے"۔

اس نے فرش پر پھونک ماری۔ شاید گرد کی اوپری پرت ذرا پرے سرک گئی ہو، ورنہ عالم یہ

تھا کہ وہ قفس کی طرح وہیں دراندی کیونکہ اس نے فرش سے علیحدہ اپنی ایک شناخت قائم کر لی تھی۔

"کیسے صاف کیا جائے؟" —

"رومال؟ — لیکن رومال سے تو ابھی ڈھیر سارے کام لینے ہیں"۔

اس نے اپنے ہوش و حواس یکجا کئے تو اسے جابجا میلے کچیلے بوسیدہ کپڑے دکھائی دئے۔

"اب تو یہ ان ڈھیر سارے کپڑے ہوں گے"۔

اس نے ایک کپڑا اٹھایا، اور اس سے تھوڑی سی جگہ کو اچھی طرح صاف کیا۔ پھر صاف کی

ہوئی جگہ پر پسر کر آرام کر بیٹھ گیا۔

تب ہی اس نے تھیلے سے کھجور کے کچھ دانے نکالے اور انہیں آہستہ آہستہ کھانے لگا۔

اچانک اضطراری طور پر اس نے ایک گٹھلی گنبد نما چھت کی طرف اُچھال دی۔ معاً اسے خیال آیا کہ اگر اس گرد و غبار اور جالوں کے آسمان کے درمیان کوئی کل چھپا ہوگا تو اس گٹھلی سے ٹکرانے پر یقیناً احتجاج کرے گا۔ آج اسے کھجور کی گٹھلی کا صحیح استعمال معلوم ہوا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چھت کو گھورتا رہا۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس طور پر کہ آنکھیں اوپر کی جانب لگی تھیں۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک اسی انداز سے اُس نے کئی چکر لگائے۔ وہ اپنی آنکھوں سے پوچھتا — "تم نے کچھ دیکھا؟" —— اور ہر بار وہ ایک ہی جواب دیتیں —

"بیکار ہے۔ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔"

"خیر دیکھا جائے گا اللہ مالک ہے۔"

اور یہ کہہ کر اُس نے چھاگل سے تھوڑا سا پانی پیا، اور پھر نئے حوصلوں اور تازہ امیدوں کے ساتھ کتاب کی الماریوں کی پشت پر جو تنگ سی راہداری بنی ہوئی تھی، اس میں داخل ہوگیا۔ اُدھر بھی گرد و غبار اور جالوں کا سامنا تھا۔ اِدھر بھی اسے کئی انسانی ڈھیر ملے۔ اب وہ ان سے کسی قدر آشنا ہو چکا تھا، اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ وہاں کچھ دیر اور رہا تو یقین ہے کہ وہ ان سے باتیں کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

"سالے کس طرح کونے کھدروں میں گھُس کے مرے ہیں!"

"مرنا ہی تھا تو شریف آدمیوں کی طرح فرش پر لیٹ کر مرتے۔"

لیکن 'شریف آدمیوں' کی ترکیب پر وہ خود ہی ٹھٹک اٹھا۔

"شریف آدمی اس بند تہہ خانے میں مُردوں کے اس دیار میں کیوں آتا؟" —

کتاب کی الماریوں کی پشت پر بھی وہ دیر تک ایک ایک الماری کے پاس رک کر اور انہیں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک کئی بار ٹٹول کر اور تھپتھپا کر دیکھتا رہا کہ شاید کہیں وہ کل مل جائے، لیکن اِدھر بھی اسے صرف مایوسی ہاتھ لگی۔

"کمبخت نے پتہ نہیں وہ کل کہاں چھپا رکھا ہے؟" — وہ زور سے بڑبڑایا "یا ممکن ہے ڈھیر ہی سے ہوا ہو —— دراصل اس بند تہہ خانے میں کہ جس کی چھت گنبد نما تھی، ہلکی سی ہلکی آواز بھی اپنا حجم بڑھا لیتی۔

الماریوں کی قطار سے باہر نکلا تو ایک بار پھر وہ عبرت بن چکا تھا۔ اگر اس حالت میں گلی کے لڑکے اسے دیکھ لیں تو دور بھاگ کھڑے ہوں۔

ہاں ایک گلی ہوتی ہے، ایک محلہ ہوتا ہے، سڑک ہوتی ہے، شہر ہوتا ہے، آبادیاں ہوتی ہیں — لیکن اس عالم میں اسے یہ گمشدہ جلوے کیوں یاد آ رہے ہیں۔ یہ تو ایک ایسا بند تہہ خانہ ہے جسے کھولنے والا کل ہی کہیں گم ہو چکا ہے۔

اور اگر کل ملنے پر وہ یہاں سے نکل بھی جائے تو یہاں آبادیاں اور کوچہ و بازار کہاں؟ —

"پتہ نہیں کس خدائی خوار نے اسے ایسی جگہ بنایا ہے، جہاں دور تک ریت ہی ریت پھیلی ہے — یہ مقام تو گویا تاریخ کا ایک ایسا صفحہ ہے جس کے آگے پیچھے کے سبھی صفحے سادہ ہیں — نہ پیچھے کچھ ہوا تھا، نہ آگے کچھ ہو گا۔

یہاں تو اگر کسی کو مدد کے لئے آواز دینا چاہو تو یہ بھی بیکار ہے کہ یہاں تو دور دور تک انسانی آواز کا کوئی سننے والا ہی نہیں ملے گا۔

کوئی سننے والا نہیں —— ہاں مگر خدا۔

اور وہ وہیں خاک کی چادر پر سر بسجود ہو گیا۔

"بس تیری رحمت کا سہارا ہے، تیاری میں پھنس گیا تھا۔"

وہ دیر تک سجدے میں پڑا رہا۔ پھر جب اس نے سجدے سے سر اٹھایا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل کسی قدر ہلکا ہو گیا ہے۔

اس کے منہ میں خاک بھر گئی تھی، چنانچہ اس نے خاک میں لتھڑا ہوا تھوک ایک بار جواہرات کی الماریوں کی سمت اور دوسری بار کتاب کی الماریوں کی سمت پھینکا۔

اور پھر وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

تب ہی اچانک اس کے ذہن میں ایک بات آئی، اور وہ اپنے آپ پر جھنجلا اٹھا کہ یہ بات اس سے پہلے اس کے ذہن کیوں نہیں آئی تھی۔

"یہ تہ خانہ ہر طرف سے بند ہے، روشنی آنے کی کوئی راہ نہیں، لیکن پھر بھی تہ خانہ روشن ہے۔"

یہ سوچ کر ایک بار پھر اس کے اندر ہمت پیدا ہوئی — "روشنی کے منبع کا پتہ چلانا چاہئے یقینی اس راہ میں وہ کل بھی مل جائے گا۔"

وہ غور کرنے لگا۔

روشنی یہیں کہیں سے آرہی ہوگی — دیواروں میں کوئی شگاف نہیں ہے۔ فرش پر گرد و غبار کا ایک متوازی فرش بن گیا ہے۔ گنبد نما فرش پر جالوں کا شامیانہ کھینچا ہے، اور لمبی لمبی لٹیں لٹک رہی ہیں۔

سوچتے سوچتے وہ اس فیصلے پر پہنچا کہ ہو نہ ہو ان ہی الماریوں میں وہ روشنی کا منبع اور وہ کل چھپا ہوگا، جس کے استعمال کرنے سے راستہ کھل جائے گا، اور تب اتنے بڑے خزانے کا وہ اکیلا مالک ہوگا۔

لیکن الماریاں مقفل تھیں اور ان پر شیشے جڑے تھے۔

"یہ زنگ آلود قفل تو ہتھوڑے کے بغیر نہیں ٹوٹ سکتے، بس ایک ہی طریقہ ہے کہ الماریوں کے شیشے توڑ کر ان میں تلاش کیا جائے!"

شیشے کس طرح ٹوٹیں گے؟ —

مکوں سے؟ —

پر دوسری ہی ساعت اس کے اندر کے ہوشمند فرد نے کہا۔

"میاں کس بھرم میں پڑ گئے۔ اگر شیشے اپنے مکوں سے توڑو گے تو ہاتھ بری طرح زخمی ہو جائے گا۔ اور اگر خون نہ بند ہوا تو؟ — اگر یہاں سے نکلنے کی ذرہ برابر بھی امید ہے تو خود کو ہر طرح بچانا ہوگا۔"

اُس نے سر ہلا کر کہا ــ "تو ٹھیک کہتا ہے۔" اور وہ شیشے توڑنے کے طریقوں پر غور کرنے لگا ــ کوئی اوزار نہیں ــ نہ لوہا نہ پتھر ــ

اچانک اسے خیال آیا کہ یہ جو اتنے سارے ڈھیر پڑے ہیں، کیوں نہ ان میں کسی کی ہڈی نکال جائے۔

اس تہہ خانے میں جب بھی کوئی چھوٹا موٹا سا خیال اس کے ذہن میں پیدا ہوتا تو معاً اس کا دل اس کی تعریف و توصیف شروع کر دیتا۔

'وہ راستہ دکھلانے والا ٹھیک ہی کہتا تھا ــ تو واقعی ذہین آدمی ہے۔'

تب اُس نے سامنے پڑے ہوئے کئی ایک ڈھیروں میں سے ایک ڈھیر کا انتخاب کیا جو نسبتاً بڑا تھا۔

اس نے ٹانگ کی ایک بڑی ہڈی کے متعلق فیصلہ کیا کہ وہ کارآمد ثابت ہوگی ــ تھوڑی سی محنت کے بعد وہ ہڈی باہر آ گئی۔

"واہ واہ کیا اوزار ملا ہے" ــ اس نے اس ڈھیر کو متشکرانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ــ "جیتے رہو میرے شیر! آخر تم کام آ ہی گئے۔"

اُس پر اس کے دل سے آواز آئی ــ "زندگی اور موت میں بس تھوڑا ہی سا تو فاصلہ ہے۔"

وقت کا حساب کتاب وہ اپنی جھولی کی تیزی سے ختم ہوتی ہوئی کھجوروں اور چھاگل میں تیزی سے نیچے اترتے ہوئے پانی کو دیکھ کر کر رہا تھا۔

پہلے اس نے جواہرات کی الماریوں کا رُخ کیا اور ابتدا اُدھر سے کی جدھر سونے کی سلیں رکھی تھیں۔ اُس نے شیشے کو اچھی طرح توڑ کر اسے ہموار کر دیا تھا تاکہ سامان نکالنے میں کھرونچے نہ لگیں۔ الماریاں سب ہی ایک جیسی وضع کی بنی ہوئی تھیں اور ان میں دونوں جانب تین تین شیشے لگے تھے ــ وہ شیشے توڑتا جاتا اور الماری کا سامان ایک کونے میں ڈھیر کرتا جاتا۔ اس طرح تھوڑی ہی دیر میں وہ الماری خالی ہو گئی۔

تب ہاتھ بچا بچا کر اس نے اوپر کے خانے، درمیانی خانے اور نیچے کے خانے میں لدی تھی

کے سوتے اور اس کل کی تلاش کی، جسے دباتے ہی یہ تہہ خانہ کھل جائے گا۔

وہاں کچھ نہ ملا۔

ابھی چار الماریاں سونے کی سلوں اور جواہرات کی اور پانچ الماریاں کتابوں کی باقی ہیں اور وقت کم ہے (کہ وقت کھجوروں کی ایک چھلی اور پانی کی ایک چھاگل میں سمٹ آیا تھا)۔

پہلی الماری کو اچھی طرح ٹھکانے لگا چکا تو اس نے سوچا۔

'مرے ہوئے یار کو کتنی زحمت دی جائے' اور یہ سوچ کر اس نے ڈھیر کی طرف اس کی ہڈی پھینک دی۔

اب اس کے ہاتھ میں سونے کی ایک بڑی سل تھی، جس سے وہ دوسری الماری کے شیشے توڑ رہا تھا۔ پہلی الماری کی طرح وہ اس الماری کے بھی شیشے پر شیشے توڑتا رہا، اور سامان ایک کونے میں ڈھیر کرتا رہا۔

اس الماری کا بھی اس نے اچھی طرح جائزہ لیا — کل یہاں بھی نہیں ملا۔

"سالا فریبی، کہتا تھا، اسی طرح کا کل تہہ خانے میں بھی ملے گا۔"

تب اس نے ڈھیروں کے چاروں طرف بکھرے ہوئے بوسیدہ کپڑے اکٹھا کر لئے۔

"یہ داستان پارینہ کے بکھرے ہوئے باب ہیں اور اب یہ بھی کام آجائیں گے۔"

جب وہ ٹوٹے ہوئے شیشوں کے بڑے بڑے ٹکڑے سونے کی سلوں اور ہیرے جواہرات کے قریب رکھ آتا، تو مُردوں کے ان بوسیدہ کپڑوں سے فرش کو اچھی طرح صاف کر لیتا کہ کہیں کوئی شیشے کا چھوٹا ٹکڑا یا باریک سا ریزہ بھی نہ رہ جائے کہ اگر بے خیالی میں پاؤں چپل سے باہر نکل گیا تو یہ ننھے ننھے ریزے بھی ان دردوں کی طرح اپنی پیاس بجھانے پر تل جائیں گے۔

وہ زر و جواہر کی سبھی الماریوں کے شیشے توڑ کر انہیں اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ اسے کہیں بھی کچھ ہاتھ نہ لگا۔

ایک کونے میں سیم و زر کا انبار لگا تھا۔ اس سے قریب ہی ٹوٹے شیشوں کا ڈھیر تھا، اور عالم یہ تھا کہ انسانی ذہن بچوں کے درمیان ایک زندہ فرد تھا، جو اس طرح گرد و غبار میں اٹا ہوا تھا کہ اگر

وہ آبادیوں میں نکل جاتا تو لڑکے 'بھوت بھوت' چلاتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے۔
وہ نزع جس کا وقت کھجور کے چند دانوں اور چھاگل کے دو چار گھونٹ پانی کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔
— تہہ خانہ اب بھی روشن تھا۔

اس نے دل میں حساب کیا — ۷۲ گھنٹے تو یقیناً گذر چکے ہوں گے — تین دن اور تین راتیں۔

'اللہ کا شکر ہے کہ ابھی میرے ہوش و حواس بجا ہیں' اور پاس میں کچھ کھجوریں اور تھوڑا پانی باقی ہے۔'

تب وہ کتابوں کی طرف بڑھا۔ ان کتابوں کو یقیناً اس کل کا علم ہوگا، مگر دوسری ہی ساعت وہ یہ سوچ کر کانپ اٹھا کہ ہزاروں کتابوں کے اس خزانے کی چھان بین کے لئے تو ایک عمر چاہئے اور ان حالات میں تو اس کا دو چار دن جینا بھی مشکل نظر آتا ہے۔

پھر بھی اس نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔

ادھر کی الماریوں کے شیشے بھی توڑ توڑ کر وہ پہلے والے ڈھیر پر رکھتا جاتا اور کتابیں اس گوشے میں جو سونے چاندی اور جواہرات کے گوشے کے عین مقابل تھا۔

پہلی الماری خالی ہوئی تو اس نے کل کی تلاش شروع کی — سب بیکار —

پھر دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں۔

کتابوں کی الماریوں کی بھی اسی طرح جانچ پڑتال کر چکا تو پھر وہی بات اس کے دل میں آئی کہ ہو نہ ہو کل کا راز انہی کتابوں میں پوشیدہ ہے۔ کتابیں یہاں کسی مصلحت سے رکھی گئی ہوں گی کہ اگر نجات حاصل کرنا ہے تو تہہ خانے کی کل کو ان کتابوں میں تلاش کرو۔ لیکن لاتعداد کتابوں کے اس ذخیرے کو کھنگالنا کیا دو چار گھنٹے یا دو چار دنوں کی بات تھی؟

شاید ایک عمر گنوانے کے بعد بھی یہ ذخیرہ اپنے سینے کا راز اگلے اور وہ بھی کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی — اور وقت تو دراصل چند کھجوریں اور تیزی سے سوکھتی ہوئی چھاگل بن چکا تھا۔

اب یہ شبہ یقین ہو چکا تھا۔ ایک طرف کی الماریوں سے نکلے ہو کر اپنی ساری دولت اپنا سارا

بیش بہا اثاثہ ایک کونے کے سپرد کر دیا تھا، اور دوسری جانب کی الماریوں نے تختے ہو کر کتابوں کی صورت میں اپنا سارا علم، ساری دانش ایک دوسرے کونے کو سونپ دی تھی۔

ان حالات میں اب یہاں بھائیں بھائیں کرتی الماریاں ہیں۔ ایک طرف سونے کی سلیں، سونے اور چاندی کے قیمتی ظروف اور ہیرے جواہرات ہیں، تو دوسری طرف کتابوں کا ڈھیر اور ان سے متصل شیشوں کا انبار — پھر جا بجا ننگے انسانی ڈھانچے اور ان کے ملبجے، بوسیدہ اور کرم خوردہ ملبوس —

ان کے علاوہ تہہ خانے میں گرد و غبار، جالے اور ان کی لٹکتی ہوئی فانوسوں، مکڑوں، چیونٹیوں اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کی عملداری تھی۔

اُس نے سوچا موت اور حیات کے درمیان صرف ایک لباس ہی تو حائل ہے۔

جب اس کی جھولی میں کھجور کے دو چار دانے اور چھاگل میں چلو بھر پانی بچ رہا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ ان چیزوں میں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔

معدہ خالی خالی ہوا تو اس کے سونگھنے کی طاقت خاصی تیز ہو گئی — اور اب بُو جو کتابوں کی تھی، بُو جو ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کی تھی، بُو جو اس مدتوں سے بند تہہ خانے کی تھی، بُو جو گرد و غبار اور جالوں کی تھی — بُو جو کیڑے مکوڑوں کی تھی اور بُو جو انسانی ڈھانچوں کی تھی۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر بُو باقی دوسری بوؤں کے سینے پر سوار ہے، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں تیز تر کون سی ہے۔ دو چار دن کی بھوک اس کے شامہ کو اور بھی تیز کر دے گی، اس وقت شاید وہ اس لائق ہو جائے کہ اور بوؤں کے ساتھ ہی اپنی بُو کا بھی احساس کر سکے، اور تب ہی وہ صحیح طور پر اس بات کا فیصلہ کر سکے گا کہ ان میں سب سے منفرد بُو کون سی ہے۔

مگر یہ روشنی جو کسی طور اپنے منبع کا پتہ نہیں دیتی ہے۔

کتابیں کیا کوئی پڑھے، نہ اتنا وقت ہے، نہ اتنا ہوش ہے۔

اس کے بعد اس نے تالوں کو کئی کئی جھٹکے دیے، سونے کی سِل سے پیٹا، لیکن انہیں نہ ٹوٹنا تھا نہ ٹوٹے۔

'مٹی کا تیل ڈالنے سے شاید ٹوٹ جاتے لیکن ....'

'شاید ان ناموں ہی میں وہ عمل پوشیدہ ہو جس کے متعلق اس دغاباز نے کہا تھا کہ اس کے دباتے ہی.....'

'کس چکر میں پھنسایا سالے نے۔'

اس نے پھر ایک بار گنبد نما چھت کی طرف نظر دوڑائی۔ اتنے جالوں میں کیا پتہ چلے۔

تب ہی اس کے ذہن میں یہ تدبیر آئی کہ الماری پر چڑھ کر دیکھا جائے، مگر یہ کہ زخمی شیشے کہیں اسے بھی زخمی نہ کر دیں۔

'اچھا تو یوں کریں،' اور یہ کہہ کر اس نے چیتھڑوں کو اپنی چپلوں کی گرد اچھی طرح لپیٹا، پھر کچھ ڈھانچوں سے ان کے پاؤں کی لمبی لمبی ہڈیاں الگ کیں اور انہیں جابجا ان چیتھڑوں سے باندھ کر ایک لمبی سی چھڑی تیار کی، اور اسے لے کر اس کا تعین کرتا ہوا، اپنے پاؤں بچاتا ہوا، ایک درمیانی الماری کے خانوں پر چڑھنے لگا۔

الماری کی چھت پر پہنچ کر وہ بری طرح جالوں میں گھر گیا۔ آنکھ ناک کان اور منہ میں جالے ہی جالے بھر گئے۔ انہیں وہ اپنی آستین سے پونچھتا رہا۔ اس کے بعد وہ اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے ہڈیوں کی چھڑی کو چھت پر گھمانے لگا۔ اس عمل میں کئی بار اوپر کی ہڈیاں جھول بھی گئیں، اور کئی بار اسے انہیں آہستہ آہستہ نیچے کر کے ان کی گرہ کو مضبوط بھی کیا۔

لیکن جالے بھرے عرش نے بھی بالآخر اسے مایوس ہی کیا۔ اور جب وہ بالکل تھک گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ چھت پر بھی کچھ ملنے والا نہیں ہے، تو پھر وہ چھڑی پھینک کر نیچے کود گیا۔

اور وقت ہوتا تو اس تھوڑی سی اونچائی سے کودنا اس کے لئے معمولی بات ہوتی، لیکن ایسے میں کہ اس کے پیٹ میں ایک دانہ نہیں تھا، اور اس پر نقاہت طاری تھی، نیچے آتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اب وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا ہے۔

لیکن کچھ دیر اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد اس میں دوبارہ طاقت آ گئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ وہ تہہ خانے کی دیوار توڑ دے۔

'دیواریں بے حد مستحکم سہی، لیکن اگر میری ہمت جوان ہے تو یہ دیواریں بھی گر سکتی ہیں۔'

یہ کہہ کر اُس نے خدا کا نام لیا اور سونے کی ایک بیل اُٹھا کر زنجیروں کو لگا دی۔

'دوستو! تم بھی اپنی جون میں آ جاؤ اور ایک ایک بیل سنبھال لو۔'

'آؤ ہم سب مل کر اس سنبھو مہادیو کو ڈھا دیں۔'

'ہم ہی نہ رہے تو یہ خزانہ رہ کر کیا ہوگا'—

'مگر کس کر آ جاؤ — مرتے میں بھی ایک وقت رہ جانا چاہئے' یہ کیا کر آئے اور چوہے کی طرح رہتے!

تب اُس نے ایک کنارے کی الماری کو کھسکا کر دیوار سے ملا دیا۔ اس طرح الماری کچھ اس جگہ سے قریب ہو گئی جہاں گنبد کا قوس ختم ہوتا تھا۔

اس کے بعد وہ سنبھلتا ہوا الماری کی چھت پر چڑھ گیا اور قوس کے خاتمے پر بیل برسانے لگا۔

۱۹۰۳ء

—— ❖ ——

وقتِ رخصت

میں تھا اور میرے مقابل میرا کزن علی تھا، اور سفر کے لئے گھر سے نکلنے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا — یہ وہ سفر نہیں تھا کہ جس کے بعد دو چار دن، دو چار ہفتے یا دو چار مہینے پر واپس آنا لازمی امر تھا اور نہ یہ وہ جدائی تھی جس کے بعد دو چار دن، دو چار ہفتے یا دو چار مہینوں کے اندر دوبارہ ملنے کی امید ہو۔ کیونکہ حقیقت تو یہ تھی کہ ہم دونوں ایک بہت بڑی بساط کے انتہائی حقیر اور بے وقعت مہرے تھے، اور ہر وقت یہ سوچتے رہتے تھے کہ —

پھر اتفاقاتِ زمانہ، دوستاں، رہے رہے نہ رہے

میں نے علی سے کہا۔ علی میں نے پچھلے دنوں ایک آسیب زدہ شہر کی داستان رقم کی تھی، جہاں کے باسیوں کو ۲۴ گھنٹے میں صرف ایک گھنٹہ آزادی کا ملتا تھا۔ وہ اس ایک گھنٹے کو بھی غنیمت جانتے تھے۔ ایک گھنٹے میں ۳۶۰۰ سکنڈ ہوتے ہیں۔ اس ایک گھنٹے کے لئے انہوں نے ایسی گھڑیاں رکھ چھوڑی تھیں جو سکنڈ کے حساب سے چلتی تھیں۔ چنانچہ ۲۳ گھنٹے گذرنے پر وہ سب اپنی اپنی کلائیوں پر سکنڈ والی گھڑیاں لگا لیتے تھے۔

اس پر علی جو بڑے غور سے میری باتیں سُن رہا تھا، کہنے لگا۔ " تو فی الوقت ہم لوگ بھی سکنڈ والی گھڑیاں لگا لیں "۔

لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا بولیں۔ دراصل اتنے تھوڑے وقفے میں کاروباری باتیں تو ہو سکتی ہیں، لیکن جو باتیں ہم اس وقت کرنا چاہتے تھے، ان کے لئے تو بڑے پُرسکون ماحول کی ضرورت تھی۔ یہاں تو یہ حال تھا کہ ہماری کلائیوں پر بھاگتی دوڑتی گھڑیاں بندھی تھیں، اور دل اتنے بھرے ہوئے تھے کہ سوچنا پڑتا تھا کہ کیا کریں۔ خود کو سنبھالیں یا آنسوؤں کو سنبھالیں۔

" خواب کی طرح سے یہ دن گذر گئے علی "۔

ڈھائی ماہ پہلے جب ہم ایک عرصۂ مدید کے بعد اس شہر میں ملے تھے، تو دیر تک ہم ایک دوسرے میں لپٹے رہے تھے، اور جب قلب کی حالت کچھ درست ہوئی تھی تو میں نے علی سے پوچھا تھا "علی میرے بھائی، تم تو بڑے حساب داں رہ چکے ہو، یہ بتاؤ کہ ہم لوگ کتنے دنوں بعد ملے ہیں؟"

تب علی نے انگلیوں پر حساب شروع کیا تھا اور کچھ دیر بعد بولا تھا۔

" ۲۵ برس، ۲ مہینے ۲ دو دن "۔

" صحیح حساب کیا تم نے۔ اتنی طویل جُدائی تو ہزاروں سال پہلے کے لوگوں نے بھی نہیں جھیلی تھی"۔

میں نے علی کی طرف دیکھا تو اس کے کالے گھنے بال خزاں کی نذر ہو چکے تھے، اور سر کے ساحل پر یہاں سے وہاں تک سفید اور کالی بِنیاں سی نظر آ رہی تھیں، اس کا رنگ ماند پڑ گیا تھا، دو دانت ——

علی نے کہا " دراصل ہماری آخری شہادت، شہادتوں کے ایک طویل سلسلے کے بعد، بنام باقی ہے، سو میرے باب میں اوپر اور نیچے کے چند دانتوں نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا "

تب ہی علی کی دلہن اور بچے بھی مجھ سے ملنے آ گئے تھے، اور سلام کر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تھے۔ علی نے ان کا تعارف کرایا تھا۔

" یہ بڑا بیٹا جسیم میڈیکل کے چوتھے سال میں ہے، ندیم ہائی اسکول میں، ندیم ساتویں جماعت میں، بڑی بیٹی ورد انہ بی۔ اے کر چکی ہے، اس سے چھوٹی شبانہ امسال انٹر کا امتحان دے گی اور رخسانہ نویں جماعت میں ہے "۔

اس وقت میں نے محسوس کیا کہ علی کے سیاہ گھنے بال جسیم کے سر پہ آ گئے تھے، اس کی رنگت وسیم نے لے لی تھی، اس کے موتی جیسے دانت ندیم کے حصے میں آ گئے تھے، اس کی آنکھوں کی چمک دردانہ کو ملی تھی تو اس کی مسکراہٹ شبانہ کو اور اس کے بات کرنے کا انداز رخسانہ نے پایا تھا۔

میں سوچ رہا تھا' علی کی بہار اب اس کے بچوں میں اُتر آئی ہے' اس طرح ٹوٹنے کے باوجود، وہ نہایت مضبوطی سے جڑا ہوا ہے۔

علی مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ "گھر اور اس کے در و دیوار۔ آنگن اور چھت۔ اور وہ جن سے اس کا جنم جنم کا رشتہ ہے۔ پھر شہر، اس کے کوچہ و بازار اور وہ سمندر جیسا دریا.....؟"

اس پر میں نے علی سے کہا تھا۔ "سب کچھ اسی طرح ہونے کے باوجود، سب کچھ اسی طرح نہیں ہے کہ ٹھہرے ہوئے پانی اور بہتے ہوئے پانی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

تب ہی علی کو جیسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ "بھائی صاحب جب اس شہر میں......" علی نے ان واقعات کو چھیڑ دیا تھا، جس سے میں کما حقہٗ واقف تھا، سو میں نے سوچا کہ علی سے کہہ دوں کہ اس تلخ ترین داستان کو دُہرانے کا کیا حاصل کہ ماضی تو وہ سنگلاخ زمین ہے، جس پر تبدیلی کا کوئی کدال اثر نہیں کرتا، لیکن پھر اس خیال سے کہ میں اس کا بڑا بھائی ہوں، اگر اس کی زبان سے اس کا دکھ درد سُن لوں گا، تو یقینی ہے کہ اس کا دل ہلکا ہو جائے گا، میں نے اُسے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔

"ایک مسلح ہجوم ہمارے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا، تو ہم نے اپنی کوٹھیاں، اپنی کاریں، اور اپنا سارا اثاثہ دریا بُرد کر دیا، صرف بیوی بال بچوں کو بچا لائے کہ یہ سب سے قیمتی سرمایہ تھے۔"

"......اب تپتی دھوپ کے اس شہر میں خدا کا شکر ہے کہ ہمیں دو وقت روکھی سوکھی مل جاتی ہے، تن ڈھانکنے کو کپڑے مل جاتے ہیں، سر پر ایک چھت ہے، اور بچے پڑھ رہے ہیں۔"

"......پونجی سے پونجی بنتی ہے، لیکن یہاں تو ہم آٹھ نفوس کا ایک ایسا قافلہ لے کر آئے تھے، جس کے پاس صرف اللہ کا نام تھا۔"

علی جذباتی ہو گیا۔ "اب میں محنت سے سرمایہ پیدا کرنے کی کوشش میں ہوں۔ مگر شاید....."

اس 'شاید' کے بعد علی غالباً یہ کہنا چاہتا ہوگا کہ یہ ممکن نہیں دکھائی دیتا، یوں کہ اب وہ خزاں

کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔

معاً مجھے وہ بھونرا یاد آگیا، جو بہار کے دنوں میں خرمستیاں کرتا رہا تھا، اور خزاں کے دنوں میں شہد کی مکھی سے تھوڑے سے شہد کی بھیک مانگنے گیا تھا۔ آج اگر وہ بھونرا ہوتا تو نہایت ہی استہزائیہ انداز میں شہد کی مکھی سے کہتا ۔" بی بی! تم نے تو بہار کے دنوں میں سخت جانفشانی کی تھی، اور بہت سارا شہد جمع کیا تھا۔"

یہ کہانی آج بے معنی ہو گئی تھی۔

میں نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا اور علی سے یوں مخاطب ہوا۔

"علی یہ نہ بھولو کہ ہماری گھڑیاں اب تک ایک ہزار سکنڈ کھو چکی ہیں، میرے بھائی بہتر یہ ہے کہ ہم ان لمحوں کو یوں ضائع نہ کریں کہ یہاں جو لمحے آپ کی گرفت میں ہیں، وہی آپ کے ہیں، ورنہ سب کچھ ماضی، سب کچھ مستقبل۔"

"سوچو کہ ہم لوگ پچیس سال بعد ملے ہیں، اور اگر پھر اگلے پچیس سال کی بات کی جائے، تو کیا ہم لوگ اس وقت تک زندہ رہیں گے ؟"

علی نے کہا۔" یہاں تو پل کی خبر نہیں۔"

وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا، لیکن اِدھر کئی عارضے اس کی جان کو لگ گئے تھے ۔ میں یقینی اس سے زیادہ صحت مند تھا، لیکن ایک بار جب ہم ایک چوڑی سڑک پار کر رہے تھے، تو علی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا، اس طور پر جیسے وہ مجھے سہارا دے رہا ہو، حالانکہ اس کی ضرورت علی کو تھی، تب ہی میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ بچہ بڑے کی مدد سے سڑک پار کرتا ہے، لیکن وہی بچہ جب ایک خاص عمر سے تجاوز کر جاتا ہے تو پھر اس کے چھوٹے اُسے سڑک پار کراتے ہیں۔ میں بھی تو علی کا بڑا بھائی تھا۔

اُس دن میں اس کے ساتھ ایک لمبے سفر پر جا رہا تھا۔ اُس کے پاس چونکہ گاڑی نہیں تھی (کہ وہ تو اپنی کاریں دریا بُرد کر آیا تھا)، اس لیے ہمیں بس سے جانا تھا۔ بڑی مشکلوں سے ہمیں ایک منی بس ملی، جو پہلے ہی سے بھری ہوئی تھی۔ مجبوراً ہمیں کھڑے کھڑے سفر کرنا پڑا، ویسے کھڑے کیا

خاک تھے، ہم تو دراصل رکوع میں تھے، اس واسطے کہ بس کی چھت بے طرح نیچی تھی۔ کچھ دور چل کر گاڑی رکی اور ایک سیٹ خالی ہوئی، تو علی نے مجھے اس پر زبردستی بیٹھا دیا، حالانکہ وہ مجھ سے زیادہ تھکا ہوا تھا۔ اس پر میں نے سوچا، علی واقعی مجھے خود سے کمزور سمجھتا ہے، لیکن دوسری ہی ساعت مجھے یہ خیال آیا کہ ممکن ہے اس نے سوچا ہو کہ پہلے بڑے بھائی کو بیٹھنا چاہیے، پھر یہ کہ میں اس کا مہمان بھی تھا۔

"علی کچھ بولو بھئی، دیکھو یہ گھڑیاں سخت بے وفا ہوتی ہیں۔ چشم زدن میں دو ہزار سکنڈ گذر گئے۔"

لیکن ہم لوگ بس ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ شاید ہمیں ماضی قریب کے وہ ڈھائی مہینے یاد آرہے تھے جن میں ان مردہ سال کو یاد کرنا ہمارا بہترین مشغلہ تھا جو پچیس سال ادھر بستے تھے۔

عزیزوں اور قرابت مندوں سے گذر کر ہم میلوں ٹھیلوں کی باتیں کرنے لگے۔

اچانک ایک دن علی پوچھ بیٹھا۔ "پتنگیں اب بھی اڑتی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں اب بھی پتنگیں اڑتی ہیں، اب بھی شیوراتری کا تہوار آتا ہے، لیکن چونکہ دوسری دلچسپیاں بڑھ گئی ہیں، اس لئے اب تمہارے وقتوں کا زور نہیں ہے۔"

اتنے میں علی کی دولہن نے مجھے ایک پیکٹ لاکر دیا۔

"بھائی صاحب یہ ایک حقیر سا تحفہ ہے۔"

پولیتھن کے پیکٹ سے ایک قمیص، ایک پتلون کا پیس اور ایک گھڑی والا قلم جھانک رہا تھا۔ قلم تو شاید اس لئے تھا کہ میں اپنے غم کی داستانیں لکھتا رہوں، لیکن یہ کپڑے؟

تب ہی میں نے علی سے کہا۔ "علی تمہیں ان حالات میں یہ سب نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

علی آبدیدہ ہو گیا۔ "بھائی صاحب آپ اتنے دنوں بعد آئے تھے، میں تو کچھ بھی نہیں کر سکا آپ کے ساتھ۔"

میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ "علی یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ سوچو کہ بفرض محال ہم اگلے پچیس سال تک زندہ بھی رہے تو کیا ہم اس لائق رہیں گے کہ ایک طویل ترین مسافت کا بار سہہ سکیں۔"

"معذوروں کی کرسی پر بیٹھ کر آنے کا حاصل کیا ہوگا میرے بھائی"۔

"بس اب پانچ سو سکنڈ اور رہ گئے ہیں کچھ باتیں کرو"۔

اچانک علی کھڑا ہو کر مجھ سے بغل گیر ہوگیا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اس کے بعد مجھے بھی ضبط کا یارا نہیں تھا۔

تب ہی ہم نے ایک دوسرے کی پیشانیوں کو بوسہ دیا۔

علی نے کہا۔ "یہ وہ پیشانیاں ہیں جن پر ہمارے باپ دادا کی مہریں ثبت ہیں"۔

"خوش نصیب ہیں آپ کہ بزرگوں کی قربت حاصل ہے، کبھی کبھار میری طرف سے بھی فاتحہ پڑھ لیا کیجیے"۔

اب وہ گھڑیاں بند ہو چکی تھیں، اور ہم اپنی نم آنکھیں لیے، ایک طویل جدائی کی سمت نکل پڑے تھے۔

سنہ ۱۹۸۳ء